361

ابوالکلام آزاد

قرآنِ حکیم کی تین سورتیں

ترجمہ و تفسیر

قرآن حکیم کی تین سورتیں

ترجمہ و تفسیر

ابوالکلام آزاد

ناشر

ادبستان ـــــ لاہور

۲۹۷۰۱۶۲
ق ۳۰
15441

ناشر: محمد رفیق ملک 9/1
ادبستان ۔ لاہور
طابع ـــ اشرف پریس ۔ لاہور
طباعت ٹائیٹل: ادبستان پریس ۔ لاہور

اشاعت: مارچ ۱۹۶۹ء
قیمت: دو روپے

Marfat.com

سورۂ والتین ——— ۹
سورۂ قدر ——— ۷۷
سورۂ والعصر ——— ۹۰
مقصدِ مساجد (سورۂ جن کی ایک آیت) ۹۷

الہلال

و

البلاغ

سے

انتخاب

اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل و نوعیت
میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے
ہٹا دیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے
خارجی مؤثرات نے اس کے چہرے پر ڈال
دیئے ہیں، پھر آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت خود
قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔

ترجمان القرآن جلد اول (تیسرا ایڈیشن)

سُورۃ والتِّین

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا
الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ
اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۙ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ
سَافِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۙ فَمَا يُكَذِّبُكَ
بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۙ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۙ

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سورۂ والتین سے
پہلے اسی سورہ کی تفسیر از مولانا مظہر الدین صاحب
شیر کوٹی آپ کے مطالعہ میں آئے گی۔ یہ پہلی تفسیر البلاغ
۱۰، دسمبر ۱۹۱۵ء میں مولانا مظہر الدین صاحب کے قلم
سے شائع ہوئی۔ اس پر مولوی وصی احمد صاحب بلگرامی
نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں پند ضروری استفسارات
پیش کئے جن کے جواب میں مولانا نے تفسیر سورۂ والتین
لکھی جو البلاغ ۲۵ فروری اور ۳ مارچ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی

انسان جب فضا و ماحول میں نگاہ کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ نیچے زمین ہے اور اوپر آسمان ہے۔ ان کی وسعت اس کے خیال سے بالاتر اور ان کی وسعت ان کے اندازے سے باہر ہے۔ ایک طرف وہ عظیم الشان پہاڑوں کو دیکھتا ہے جن کی چوٹیاں نامعلوم بلندیوں تک مرتفع ہیں۔ دوسری طرف وہ بڑے سمندروں کی لہروں اور ان کے گرداب و طوفان خیزیوں جن کے سامنے انسان کی ہستی تو کیا اس کی زمین بھی کاہ کی طرح ہیچ ہوتی ہے۔ ان عظیم ترین ہستیوں سے قطع نظر کر کے جب وہ چھوٹے چھوٹے جسموں کی قوت پر توجہ کرتا ہے تو اور زیادہ متعجب ہوتا ہے کہ ہستی و حیات کے یہ حقیر ذرات طاقت و عمل کی کیسی حیرت انگیز مثالیں اپنے اندر رکھتے ہیں!!

وہ اڑنے والے پرندوں کی برق رفتاری پر خیال کرتا ہے۔ خونخوار جانوروں کی طاقت کو دیکھتا ہے۔ ابر کے ایک معمولی ٹکڑے سے بڑے بڑے شہروں کا زیر و زبر ہونا اس کے سامنے آتا ہے۔ پھونک سے اڑ جانے والی چنگاری کی قوت اس کے پیش نظر ہوتی ہے اور جب ان تمام

Marfat.com

مناظرِ قدرت کو اپنے سامنے لاتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ اے ہستیِ انسانی! تو کیا ہے؟ تیری حقیقت کچھ بھی نہیں ـــــ بحرِ وجود میں پانی کا ایک بلبلہ، عالمِ خلق میں ہوا کا ایک جھونکا، میدانِ تکوین میں مجموعۂ غبار کا ایک نقشِ پا ـــــ!!!

لیکن سورۂ مبارکہ "والتین" میں قرآن حکیم نے اس خیال کی تردید کی ہے اور شرفِ انسانی کے دلائل مبینہ پیش کیے ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ عالمِ وجود کی دوسری چیزوں کے ساتھ انسان کو کیا نسبت ہے؟ بلاشبہ انسان پانی کا بلبلہ ہے۔ مگر کون سا پانی؟ وہ جو آبِ بقا کا ایک سرچشمہ ہے۔ کچھ شک نہیں کہ انسان ہوا کا ایک جھونکا ہے مگر کس ہوا کا؟ وہ جو باغِ وحدت کی ایک لہر ہے۔ ہاں یقیناً انسان کا وجود ایک نقشِ پا ہے، مگر کیسا نقشِ پا؟ وہ جو وجود بحت کا سب سے زیادہ مکمل نشان ہے۔ خلاصہ یہ کہ سریرِ ظہور کا تاجدار اور منصۂ شہود کی رونق، وجودِ انسانی ہی ہے۔

انسان کا اشرفِ مخلوق ہونا ایک ایسا بین دعویٰ ہے جس کے لیے احتیاجِ دلیل نہ تھی۔ لیکن اپنی ہستی سے خود فراموشی ہی کبھی کبھی مانعِ کار ہو جاتی ہے اور اکثر دنیا کے بڑے بڑے اعمال صرف اس لیے ناتمام رہ جاتے ہیں کہ ان کے کرنے والے اپنے آپ کو نہایت ضعیف و ناتواں سمجھ کر ہمت ہار دیتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایسے ناموسِ الٰہی کے لیے جو "تبیانا لکل شئ" اور "نورِ مبین" کی حیثیت رکھتا ہو ضرور تھا کہ انسانی فضیلت کی کامل حقیقت کو اس کے سامنے صاف صاف پیش کر دے۔

علاوہ ازیں یہ دین حنیف کے اس اہم ترین رُکن کی ایک تمہید اور مقدمہ بھی تھا جسے میں حضرت شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی اصطلاح میں "قانونِ مجازات" کے لقب سے تعبیر کروں گا۔

پس اس سورہ کے مضمون کی تقسیم دو قسموں میں ہو سکتی ہے:

۱۔ اشرف انسانی کا ثبوت ۲۔ قانونِ مجازات

مبحثِ اوّل

والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین
لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

انجیر، زیتون، طور سینا، مکہ معظمہ، اس دعویٰ پر شاہد ہیں کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر حالت میں پیدا کیا ہے۔

تقویم کی تفسیر میں قاضی بیضاوی تحریر فرماتے ہیں:-

تعدیل بان خص بانتصاب القامۃ وحسن صورۃ واستجماع خواص الکائنات ونظائر سائر الممکنات (انتھیٰ)

تقویم کے معنی تعدیل کے ہیں اور اس سے مُراد یہ ہے کہ انسان سرو قامتی، حسن صورت اور کائنات کے تمام خواص اور تمام ممکنات کی تمثیلات کا مجموعہ ہے۔

اسی مضمون کو امام رازی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:-

التقويم تصيير الشيء على ما ينبغي ان يكون في التاليف والتعديل يقال قومته تقويما فاستقام وتقوم (انتهى)

تقویم کے معنی ہیں کسی شے کا ایسی حالت میں پیدا کرنا جس کے لائق وہ اپنی تالیف و تعدیل میں تھی۔ ایسے موقع پر جب کوئی شے چند چیزوں سے ترتیب دے کر بنائی گئی ہو اور درست ہو تو اہل عرب کہا کرتے ہیں قومته تقویما فاستقام وتقوم۔

محدث ابن جریر طبری اپنی شہرہ آفاق تفسیر میں "تقویم" کے مختلف معنی نقل کرتے ہوئے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں۔

واولی الاقوال فی ذلک بالصواب ان یقال ان معنی ذلک فی احسن صورة واعدلها (انتہی)

تقویم کے معنی میں بہترین قول یہ ہے کہ اس کے معنی احسن و اعدل حالت کے ہیں۔

یہ تینوں مفسر اور ان کے سوا اور مفسرین بھی اگرچہ ترتیب الفاظ و تعبیر مقصد میں مختلف ہیں تاہم منشاء و مآل سب کا ایک ہے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بیضاوی نے نہایت مفصل اور جامع الفاظ میں تقویم کا مفہوم ادا کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کیا بلحاظ حسن صورت اور کیا بلحاظ بلندی قامت انسان تمام ممکنات کی تمثیل اور کل کائنات کے خواص کا مجموعہ ہے" اور یہ انسانی شرف کی بہت بڑی دلیل ہے کہ جو اوصاف (مثلاً حیوانات میں حرکت اور

ارادہ و انتقام، نباتات میں نشوونما، ملائکہ میں طاعتِ ربّ کریم وغیرہ وغیرہ، فرداً فرداً و دیگر مخلوقات میں موجود ہیں، وہ سب کے سب ایک وجود انسانی میں مکنون ہیں۔ فلینظر الناظرون و یمحص المشتاقون۔

اسی مضمون کو قرآن حکیم نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے ورنہ مقصود ایک ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وصورکم فاحسن صورکم — اے انسانو! خدا نے تم کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

یہاں صورت سے مراد صرف نقش و نگار جسمانی یا خدوخال نہیں، بلکہ صور معقولہ و قوائے ادراکیہ بھی ہیں۔ (کما صرح بہ الاصفہانی فی الذریعہ والمفسرون فی تفسیرھم)

دوسری جگہ بہت زیادہ تفصیل سے اس طور پر مذکور ہے۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔

ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا فرمائی اور تری و خشکی میں ان کے چلنے کے لئے سواریاں بنائیں۔ عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں۔ یہاں تک کہ مخلوقات کے اکثر حصہ پر ان کو فضیلت و سیادت حاصل ہے۔

ان تمام آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقصود فضیلت انسانی کا ثبوت ہے۔ سورہ والتین میں اس دعویٰ کو مدلل و مشرح کیا گیا ہے اور ثبوت میں چار دلیلیں بصورت قسم پیش کی گئی ہیں۔

محققین نے محاوراتِ عرب و اشعار جاہلیت سے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ قسم اپنے مابعد بیان کے لئے شہادت و دلیل ہوتی ہے! امام رازی سورۂ ذاریات کی تفسیر لکھتے ہوئے شروع ہی میں تحریر فرماتے ہیں۔

ان الایمان اللتی حلف اللہ تعالیٰ بھا کلھا دلائل اخرجھا فی صورۃ الایمان مثالہ قول القائل لمنعمہ وحق نعمتک الکثیرۃ انی لا ازال اشکرک۔ فیذکر النعم وھی سبب ھفیل للدوام الشکر۔

تمام وہ قسمیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمائی ہیں، سب کی سب قسم کی صورتوں میں دلائل ہیں جس طرح کوئی اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہتا ہے وحق نعمتک الکثیرۃ انی لا ازال اشکرک۔ اور اس قول میں نعمتوں کا ذکر دوام شکر کے لئے سبب قرار دیتا ہے۔

اس مسئلہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم پر یہ چار قسمیں تین، زیتون طور سینین، بلد امین کیونکر دلیل ہو سکتی ہیں۔

تین وزیتون کی شہادت

"تین" کے معنی بعض مفسرین نے دمشق کے ایک پہاڑ اور بعض نے بیت المقدس کے ایک پہاڑی مقام کے بیان کئے ہیں لیکن یہ سب اقوال مرجوح ہیں اور ان کے ضعف کی طرف بیضاوی وغیرہ مفسرین نے اشارہ بھی کیا ہے۔ مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس کے معنی اسی پھل کے لئے جائیں جس کو ہم اپنی زبان میں "انجیر" کہتے ہیں۔ اسی طرح زیتون سے بھی مراد وہی مشہور پھل ہے جس سے روغن نکالا جاتا ہے اور جو اہل عرب کی ہر دلعزیز وجان پرور غذا ہے۔

ابن جریر لکھتے ہیں:

من الحسن فی قولہ اللہ والتین والزیتون قال تینکم ھذا الذی یوکل وزیتونکم ھذا الذی یعصر (حدثنا ابن بشار)

حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ قرآن شریف میں "تین" سے مراد وہی پھل ہے جسے لوگ کھاتے ہیں اور زیتون سے مراد وہی ہے جس سے روغن نکالتے ہیں۔

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں تین وزیتون کے معنی بیان کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں۔ ھو تینکم وزیتونکم ھذا۔ اے اہل عرب! تین وزیتون سے مراد یہی تمہارے مشہور پھل ہیں۔

ان دونوں الفاظ کے معنی متعین ہونے کے بعد غور کرو کہ یہ شرف انسانی پر کس طرح شاہد ہیں: تم جانتے ہو کہ انجیر ایک نہایت چھوٹا سا پھل ہے لیکن غذا و دوا میں بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ ذائقہ کے لحاظ سے نہایت شیریں ہے۔ باعتبار طبی فوائد کے قاطع بلغم، ملین طبع، مطہر کلیتین، مسمن بدن وغیرہ اس کے معمولی خواص ہیں۔

پس انجیر شاہد ہے کہ جس طرح یہ جسم صغیر ہو کر بے شمار فوائد کا مجموعہ ہے اسی طرح وجود انسانی بھی جسماً مختصر لیکن مختلف قوتوں کا پتلا، گوناگوں جذبات کا سراپا، بوقلموں اسرار کا مجسمہ ہے۔

بے شک اس کی مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچہ عالم تکوین کی غیر محدود کوہ پیکر ہستیوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر ان ہڈیوں میں ہی وہ طاقت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں اور سمندروں کے طوفانوں کو مسخر کر سکتی ہے۔

دوسری شہادت زیتون کی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح زیتون میں روغن حلول کئے ہوئے ہے اور زیتون کی قدر اس کے روغن ہی کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح انسانی جسم میں روح کا حلول ہے اور اس کا شرف بھی اس کی روح ہی سے ہے، ورنہ انسان مٹی کا ایک ڈھیر یا حشرات الارض کی گھناؤنی غذا ہے اور بس۔

یہاں پر دو سوال اور قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ جناب باری نے زیتون ہی کو شہادت کے لئے کیوں منتخب کیا جب کہ یہ فائدہ اور روغن دار

پھلوں یا اسی قسم کے تخموں سے بھی حاصل ہو سکتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن کریم کے اوّلین مخاطب ہیں ان کے سامنے جو چیز بکثرت موجود تھی، وہ زیتون ہے اور جو فوائد غذا و دوا کے اعتبار سے انہیں حاصل ہو رہے تھے، وہ بالکل ان پر واضح و آشکار تھے ــــ!

دوسرا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جب کہ رُوح جسم سے اعلیٰ و اشرف اور اس پر حاکم ہے تو اس کی شہادت کو جسم کی شہادت سے مقدّم ہونا چاہئے اور اس لئے والتین کی جگہ والزیتون کے لفظ سے سورت کو شروع کرنا چاہئے تھا۔

یہ درست ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ دلیل و اثبات کے موقع پر مقدّم ہونے کا وہ چیزیں حق رکھتی ہیں جو تجارب و محسوسات کے دائرہ میں ہوں۔ قطع نظر فلسفہ جدیدہ کے جس کی بنیاد کا سنگ اوّلین ہی تجربہ ہے۔ اگر ارسطو و افلاطون کے فلسفہ کو دیکھو اور کم از کم علامہ بہاری کی سلم کے آخر میں برہان کی بحث سامنے رکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ دلیل مفید یقین وہی ہو سکتی ہے جس کے مقدمات کی ترتیب امور یقینیہ اور تجربہ پر ہو یا کم از کم ایسے مقدمات کی طرف ان کی تحلیل ہوتی ہو۔ بہر حال جسم اور اس کے فوائد محسوس بالکل ظاہر ہیں اور رُوح غیر محسوس ہے۔ پس اس لئے جسم کی شہادت کو حق تھا کہ وہ رُوح کی شہادت پر مقدم ہو اور سورت کو والتین ہی کے لفظ سے شروع کیا جائے۔

Marfat.com

نکتہ

زیتون کے لفظ میں ایک اور لطیف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ جب زیتون سے روغن نکال لیا جاتا ہے تو اس سے دوسرے فوائد کے علاوہ چراغ بھی روشن ہو سکتا ہے اور وہ اپنے اردگرد تمام چیزوں کو منور کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ روح جو قفس عنصری میں مقید ہے اگر بقدر طاقت بشری اس کو بھی علائق مادیہ سے پاک و صاف کر لیا جائے تو پھر اس سے بھی بہت سی تاریک روحیں منور اور ظلماتی قلوب روشن ہو سکتے ہیں۔

طور سینین کی شہادت

"طور سینین" کی تفسیر میں تمام مفسرین اپنی عادت قدیم کے موافق بہت سے احتمالات بیان کرتے ہیں۔ مگر دراصل یہ سب تکلف ہے۔ اس سے مراد وہی پہاڑ ہے جو حضرت موسیٰ کے لئے جلوہ گاہ ربانی اور بنی اسرائیل کے لئے قانون شریعت کا مہبط تھا۔ ابن جریر نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:-

واولی الاقوال فی ذلک بالصواب قول من قال طور سینین جبل معروف۔

صواب تر قول اس بارے میں اس شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ طور سینین سے مراد مشہور و معروف پہاڑ ہے۔

Marfat.com

یہ شہادت ایک عجیب و غریب شہادت ہے جو ثابت کرتی ہے کہ ضعیف و ناتواں انسانی پتلا میں مادی ترقی کی قوت کہاں تک ہے اور وہ اپنے کمال کے بازوؤں سے اڑ کر کہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سے پہلے تم بنی اسرائیل کی حالت پر نظر کرو۔ وہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اسرائیلی برکت اور حضرت ابراہیمؑ کے خدا کے وعدے کو فراعنہ کے قدموں میں پامال کر دیا تھا۔ اس بدبخت قوم نے فطرت کی سب سے زیادہ گراں قدر نعمت (یعنی حریت) کو ہمیشہ غیروں کی چوکھٹوں پر قربان کیا۔

یہی بدنصیب بنو اسرائیل تھے جو انسانی عبدیت کے خون سے پیدا ہوئے، غلامی کے دودھ سے پلے، استبداد کی آب و ہوا میں بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ شرف قومی کا پاک جذبہ جس کی حفاظت دل کے خون اور دماغ کی روح سے ہونی چاہیے تھی، فراموش کر دیا گیا۔ آہ! صرف یہی نہیں بلکہ اُنہوں نے دیکھا کہ ظالم مصریوں کی خون آشام تلواریں اپنی پیاس ان کے معصوم بچوں کے خون سے بجھاتی ہیں اور ان کی مخدرات کی عصمت کی فرعونیوں کے وحشت کدہ پر قربانی ہو رہی ہے۔ یذبحون ابناءھم ویستحیون نساءھم۔ مگر تاہم اس بے حسی کی صدا سے باز نہ آئے کہ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔

بدقسمت عبرانیوں کی یہ حالت تھی، مگر جب جبل طور پہ جس کی قسم اس سورت میں کھائی گئی ہے، موسیٰ علیہ السلام کو قانون ملت عطا ہوا اور اس پر آئندہ نسل نے عمل کیا تو پھر وہ حالت ہوئی کہ جو غلام تھے وہ شہنشاہ ہو گئے

15421

جس قوم کو مصر میں سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے بھی پیٹ بھرنے کے لیے پیٹ بھر نصیب نہ ہوتے، اس کے قدموں پر شام کے خزانے جمع کیے گئے کنعانیوں اور حبشیوں کے دلفریب سبزہ زاروں کی یہ قوم مالک ہو گئی۔ اموریوںؒ اور فرزیوں، حویوں اور یبوسیوں کی دودھ و شہد بہانے والی زمین ان کے قبضہ میں آ گئی۔ اسی کے آفتاب جلالت و سطوت سے بابل و نینوا کے قصر جگمگا اٹھے اور اسی کے رعب و شوکت نے مصر کے ایوانوں کو ہلا دیا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ پہلے وہ صراط مستقیم (راہ حق) سے بے خبر تھی اور اب اس پر عامل ہو گئی۔ پہلے وہ اس قانون الٰہی سے جو طور پر نازل ہوا جو ترقی کے بے شمار اسرار سے معمور تھا، محروم تھی اور اب اس کی پرستار ہو گئی۔ پس خداوند تعالیٰ نے اسی لیے طور کو جس سے ایک بہت بڑی قوم کے عروج و زوال کی تاریخ وابستہ تھی، بطور شاہد کے پیش کیا کہ دیکھو! یہ طور شاہد ہے کہ انسان کو ہم نے اشرف ترین پیدا کیا، کیا باوجود ایک حقیر و ضعیف ہستی ہونے کے اس کا پایہ از سب سے زیادہ بلند نہیں ہے؟

اس طرح کہ پہلے جسم کی شہادت اور اس کے بعد روح کی شہادت

ؒ ان تمام الفاظ سے شام کے قبائل مراد ہیں اور یہ مضمون کتاب خروج ۳/۱۷ تا ۱۸ کے اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انعامات کا وعدہ کیا گیا تھا

بیان کی گئی تھی۔ اسی طرح تیسری شہادت میں پہلے جسمانی و مادی ترقی کا ثبوت دے کر چوتھی شہادت اس کی روحانی ترقی کی دلیل قرار پائی۔

بلد امین کی شہادت

وھٰذا البلد الامین۔ امین امن سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کرنے کے ہیں۔ امانت کو امانت اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں حفاظت کی جاتی ہے۔ امین اگر اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اپنے حقیقی معنی امن میں یہاں مستعمل ہے تو اس کے معنی ہوں گے "حفاظت کرنے والا" یا شل قتیل بمعنی مقتول اسم مفعول کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے تو اس وقت اس کے معنی ہوں گے محفوظ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں بلد امین سے مراد مکہ معظمہ (زادہ اللہ شرفہا) ہے۔ کذا صرح الکشاف والرازی والبیضاوی وغیرھم۔

پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ قاتلوں (الاثم (جو شخص کسی کو قتل کر کے بیت اللہ میں آ چھپے) کے قصاص سے اور جانوروں کے شکار سے جب کہ وہ حرم میں داخل ہو جائیں، حفاظت کرنے والا ہے۔ کیونکہ نص قرآنی میں دوسری جگہ "حرما امنا" موجود ہے۔

دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ یہ کعبہ محترمہ قتل و غارت، جنگ و جدال وغیرہ سے محفوظ ہے۔ یہ چوتھی قسم ہے اور قرآنی شرف کے جس شعبہ پر شہادت لائی گئی ہے، اس کو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے

لیکن حضرت اسماعیلؑ بھی اس مقام خلت سے محروم نہ تھے۔ چنانچہ جب راہِ حق میں اُن کو قربان کرنے کے لئے کہا گیا (انی اذبحک فانظر ماذا ترٰی) تو انھوں نے بلا تامل عرض کیا کہ اے باپ! اگر آپ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں تو میں بھی قربان ہونے کے لئے حاضر ہوں۔ یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین (۱۲۳،۷)

کعبہ کرمہ جو ابھی پرستارانِ حق و فداکارانِ ملت کی بناکردہ تعمیر ہے گویا تعلیم خلت کی درسگاہ ہے جس کو یہ بزرگوار تعمیر کرتے جاتے تھے اور اپنے جذبۂ عشق میں معمور ہو کر کہتے جاتے تھے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ ربنا واجعلنا
مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک وارنا
مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔
ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایٰتک
ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت
العزیز الحکیم۔ (بقرہ: ع ۱۵)

اے ہمارے خدا! تو ہمارے اس کام بناءِ کعبہ کو قبول فرما اس لئے کہ تو ہی ہماری دعا کو سننے والا اور ہمارے کاموں کو جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! اب تو ہم کو اپنا فرمانبردار بندہ بنالے اور ہماری نسل سے ایک مطیع و منقاد امت قائم کر۔ اے خدا! اپنے ارکانِ عبادت ہم کو ہدایت کر اور

ہم پر رحمت نازل فرما کیونکہ تو ہی تواب و رحیم ہے اور پھر

اس امت میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو ان میں سے ہو

وہ رسول تیرے احکام ان کو سنا دے اور تیری کتاب و

حکمت کی باتیں ان کو سکھا دے۔ تو سب کچھ کر سکتا ہے

اس لئے کہ تو سب پر غالب اور ہر چیز پر حکمت ہے۔

پس درسگاہ خلت یعنی بیت ابراہیمی اس پر شاہد ہے کہ انسانی روح کہاں تک ترقی کر سکتی ہے اور اس کی انتہا کیا ہے؟ تم کو معلوم ہو گیا کہ اس کی ترقی اس حد تک ہے جہاں پہنچ کر ایک ہی مقصود، ایک ہی مطلوب اور ایک ہی شاہد و مشہود سامنے ہوتا ہے جس کی چشم و ابرو کے اشاروں اور دہن حق طلب کی مسکراہٹ پر اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی قربان کر دیا جاتا ہے۔

اے گم گشتگان طریق حق ——! اگر دین حنیف تمہارے ہاتھوں میں، اسمٰعیلی خون تمہاری رگوں میں اور ابراہیمی دعا کی امت مسلمہ تم ہو تو یہ تمہارے لئے ذریعہ فلاح و نجات و بقا ہے۔ وہی جوش محبت، وہی سودائے عشق، وہی طریق ابراہیمی ہے، جس کی شہادت تمہارا کعبہ مکرمہ بزبان حال پیش کر رہا ہے اور اسی کی صدا اس کے در و دیوار سے آ رہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس امر کو مفصل بیان کیا ہے کہ [illegible] کا وجود اور ان کا اجتماع دوسرے جانداروں میں بھی ہے لیکن حصول سلطنت اور معاملہ [illegible] تمیز و [illegible] قسم شاہد ہے [illegible]

انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان دو آخری خصوصیتوں میں سے پہلی قوت حیوانیہ انسانیہ، اور دوسری قوت ملکوتیہ کا خاصہ ہے۔ پس ان خصائص وقویٰ، ان فوائد و منافع کے انکشاف کے بعد کون ہے جو اس میں شک کر سکتا ہے کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

اِستفسار

از

مولوی وصی احمد صاحب بلگرامی

Marfat.com

جناب علامہ دوراں وحید الزماں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

دام مجدکم

پس از سلام مسنون گزارش یہ ہے کہ جناب مولوی مظہر الدین صاحب شیر کوٹی نے جو سورہ والتین پر روشنی ڈالی ہے، اس کے متعلق چند ضروری استفسارات ہیں۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:۔

"انجیر، زیتون، طور سینا، مکہ معظمہ، اس دعویٰ پر شاہد ہیں کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر حالت میں پیدا کیا ہے"

طور سینا اور مکہ معظمہ کی شہادت تو واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں نور وحدت سے انہی مقاموں پر منور ہوئیں۔ ضعیف انسان کی بزرگی پر یہ دونوں صاد کرتے ہیں اور اس لئے گواہ لائے جا سکتے ہیں۔ مگر تین اور زیتون کی شہادت کے متعلق جناب موصوف یوں فرماتے ہیں:۔

۱۔ "انجیر ایک نہایت چھوٹا پھل ہے لیکن غذا و دوا

میں بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ ذائقہ کے لحاظ سے نہایت شیریں ہے۔ باعتبار طبی فوائد کے قاطع بلغم، ملین طبع، مطہر گلیتین، مسمن بدن وغیرہ اس کے معروفی خواص ہیں پس انجیر شاہد ہے کہ جس طرح جسم صغیر ہو کر بے شمار فوائد کا مجموعہ ہے اسی طرح وجود انسانی بھی جسماً مختصر لیکن مختلف قوتوں کا پتلا ہے۔"

۲۔ "جس طرح زیتون میں روغن حلول کئے ہوئے ہے اور زیتون کی قدر اس کے روغن ہی کی وجہ سے ہے اسی طرح انسانی جسم میں بھی روح کا حلول ہے اور اس کا شرف بھی اس کی روح ہی سے ہے ورنہ انسان مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔" درست

ہم نے یہ سب مانا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح انجیر اپنے جسم صغیر میں بے شمار فوائد اور زیتون اپنے قالب میں تیل کا خزانہ رکھتا ہے اسی طرح روئے زمین پر اور نیز ملک عرب میں ہزاروں لاکھوں ایسے پھل ہیں جو یہی خواص رکھتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ اتنی بڑی شہادت پیش کرتے وقت جناب باری نے انجیر اور زیتون ہی کو چنا؟

جناب موصوف کی توضیح سے تسکین نہیں ہوتی۔ انگریزی پڑھنے والے طلباء کی آنکھیں اور دل ظاہر ہے کہ آج کل کلام مجید کی معرفت و نکات سے نابینا ہیں۔ اندھا آدمی تھوڑا ہر ہر قدم پہ ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس صورت میں بینا آنکھوں کا فرض ہے کہ صحیح راستہ بتلا دیں۔ لہٰذا یہ لعفذار ساں خدمت

گرامی ہے کہ تین اور زیتون کی شہادت پر شکوک مذکورہ بالا کا لحاظ کرتے
ہوئے جناب مزید روشنی ڈالنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ باعثِ مشکوری
ہوگا ——— والسلام!

تفسیر

از

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

سورۃ التین

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سِينِينَ ۝ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ
سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ
مَمْنُونٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ
الْحَاكِمِينَ ۝ ۱ (البلاغ ۲۵، فروری ۳، ۱۰، مارچ ۱۹۱۶ء)

انجیر، زیتون، طور سینا اور مکہ معظمہ شاہد ہیں کہ بلا شبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عادل پر پیدا کیا۔ پھر اس کو بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا مگر وہ لوگ کہ ایمان لائے اور عمل صالح کئے تو ان کے اعمال کے نتائج صرف بہتری ہی کے لئے ہیں۔ ان کے عمل صالح کا بدلہ کبھی منقطع نہ ہوگا ہمیشہ پھل دے گا۔ پس اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد کون ہے جو اعمال کے نتائج سے انکار کرے گا اور اس بارے میں رسول کی تعلیم کو جھٹلائے گا؟ کیا سب سے بڑا حکم کرنے والا خدا ہی نہیں ہے جس کے قانون جزا و سزا میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی؟

۱؎ البلاغ ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء میں لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا ترجمہ حسب ذیل ہے: "ہم نے انسان کو ایک بہترین فطرت عادلہ و مقومہ کے قالب میں پیدا کیا ہے"

قرآن حکیم سے شغف و درس و تدریس آپ کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔
اس سے یہ فقیر بہت خوش وقت ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ سے اس کام کو
برکت دے ثبات عطا فرمائے اور آپ کے اقوال و افعال سے ہمارے
ملک کی عوام بھی مستفید ہو جائیں۔

آپ کا سوال در اصل ... القرآن سے متعلق ہے کہ قرآن
حکیم کی جن سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حروف قسم کے ساتھ بعض اشیاء کا ذکر
فرمایا ہے ان کی حقیقت اور مناسب تفہیم سے ان کا ربط و تعلق کیا ہے
سورہ والتین ہے۔ اور اس میں سب سے پہلے جن چیزوں کی قسم کھائی گئی
ہے وہ ... حقائق قرآنی کی ... ہیں اور ... آیات ...
مختلف نظروں کو مختلف روشنیوں میں نظر آتی ہے۔ تین و زیتون کے متعلق ایک
تفسیر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی جس کو مولانا ... صاحب نے اپنے
مضمون میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کے خواص کو نوع انسانی
کے جسم و خصوصیت کے خصائص سے تشبیہ دی ہے۔ ... کوئی ...

نہیں کہ سورت کے موضوع اور بقیہ اقسام کے ربط کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ مزید غور و فکر اور جستجوئے حقیقت کے لئے قدم اٹھانا چاہئے میں آپ کے سوال کا جواب دو صحبتوں میں دوں گا۔

چند مقدمات مہمہ

سب سے پہلے چند مقدمات آپ کے سامنے آ جائیں جن پر ہمارے تمام مباحث تفسیر مبنی ہیں۔

۱ــــ قرآن حکیم کی ہر سورت کا ایک موضوع (سبجیکٹ) ہے اور اوّل سے لے کر آخر تک وہ سورت اسی پر مبنی ہے۔ جس قدر مطالب درمیان میں آگئے ہیں وہ سب کے سب اسی ایک موضوع اصلی کے ناگز و ضروری اطراف بحث و تعلیم ہیں۔

۲ــــ ہر سورت کی ابتدا و انتہا اس موضوع کے معلوم کرنے کی کنجی ہے۔

۳ــــ جب ہر سورت کا ایک موضوع ہے تو یہ چیز بھی ضمناً آپ کو معلوم ہو گئی کہ قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں اور ایک نظم واسلو حقیقی کے ساتھ سلسلۂ بیان بتدریج اجمال سے تفصیل، دعویٰ سے دلیل، او تعلیم سے امثال و نظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے تصرّفِ آیات" سے جا بجا تعبیر کیا ہے "صرف" کے معنی لغت "ردالشئ من حالة الی حالة" کے ہیں۔ (کما صرح بہ الاصفہانی)

۴ ــــ "قسم" کے معنی شہادت و دلائل کے ہیں، قرآن حکیم نے جس چیز کو حروف قسم کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ ایک شاہد ہے جو اپنے مابعد دعویٰ کے لئے دلیل پیش کرتا ہے۔ قسم کا مقصد استشہاد ہوتا ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ خدا شاہد ہے کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا سورہ والفجر میں ہے :۔

"ھل فی ذالک قسم لذی حجر" یعنی ان چیزوں میں صاحب عقل کے لئے بڑی ہی شہادت ہے۔ منافقین کہتے تھے کہ

"نشھد انک لرسول اللہ" ہم گواہی دیتے ہیں آپ اللہ کے رسول ہیں۔ خدا نے اُن کی تکذیب کی اور کہا :

"اتخذوا ایمانھم جنۃ" انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ منافقین نے شہادت دی تھی قسم نہیں کھائی تھی پس خدا نے خود ہی شہادت کو قسم سے تعبیر کر کے حقیقت کھول دی۔

لیکن چونکہ عام مفسرین متاخرین نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا اس لئے وہ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس میں بڑائی اور عظمت ہو اس لئے تمام قسموں میں صرف عظمتوں ہی کو تلاش کرتے رہے۔ ان کی شہادتِ حق و دلالت حقائق پر نظر نہ ڈالی۔ امام رازیؒ کو فرماتے ہیں کہ قسم ایک طرح کی دلیل ہے لیکن چونکہ اصل حقیقت سے پوری طرح متاثر نہیں ہوا اس لئے اسی غلطی کو شروع کر دیتے ہیں جو اعتراف یعنی دلیل کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی تین اور زیتون کی عظمت اور بزرگی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

پھر جب اور کچھ نظر نہیں آتا تو فرماتے ہیں کہ تین (انجیر) کا مزہ بہت اچھا ہے اور وہ معدے کے لئے مسہل بلغم ہے اور زیتون کی لکڑی کے اندر تیل ہے۔ گویا نہ تو دنیا کے اندر کوئی اور پھل بلغم ہے اور نہ کوئی اور شے اپنے اندر روغن رکھتی ہے۔

سچ یہ ہے کہ متاخرین میں یہ فضیلت و مزیت اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور اُن کے ارشد تلامذہ علامہ ابن قیم کے لئے مخصوص کر دی تھی کہ حقائق و معارف کتاب و سنت کے جمال حقیقی کو بے نقاب کریں۔ اور جو پردے متاخرین نے یکے بعد دیگرے ڈال دیئے ہیں ان کو اللہ کی بخشی ہوئی قوت مجددہ و مصلحہ سے چاک چاک کر دیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے ان دو عظیم الشان انسانوں نے اقسام القرآن کی اس حقیقت کو جابجا واضح کیا ہے اور موجودہ زمانے میں سب سے بڑا خوش نصیب انسان وہ ہے جس کے دلوں کو اللہ ان مصلحین حقیقی کی تصنیفات کے فہم و درس کے لئے کھول دے کہ ان کا نورِ علم مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست ماخوذ تھا ــــــ!

Marfat.com

موضوع سورۃ والتین

دنیا میں انسان اپنے اندر دیکھتا ہے تو اُس کو جذبات و خواہشات کا ایک عجیب مخلوط اور متضاد ہجوم نظر آتا ہے۔ باہر دیکھتا ہے تو اس کی ناکامیاں اور مایوسیاں اس کی کامیابیوں اور امیدوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔

جذبات کے اعتبار سے وہ ایک ہی وجود ہے جو کبھی فرشتوں کی طرح محبت و ہمدردی اور شرافت و عفت کا پیکر ہے اور کبھی قتل و غارت اور خونریزی و سفاکی میں سانپوں کے زہر سے بدتر اور درندوں کے پنجوں سے اسفل ہے۔ وہی انسان جو جانوروں کو تکلیف میں دیکھ کر ہمدردی کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے بسا اوقات اپنے بھائیوں کا بے دریغ خون بہانے لگتا ہے تاکہ ان کے خون سے اپنی خودغرضی کی پیاس بجھائے۔

خارجی احوال کے لحاظ سے اس کی بوالعجبی اور زیادہ عجیب ہے۔ وہ ایک ہی وجود ہے جو کبھی تاج و تخت حکومت پر جلوہ آرا ہوتا ہے اور کبھی کتوں کی طرح غلامی کی [illegible] ہوتا ہے۔ یہی انسان آسمان سے اونچی عمارتوں کے بنانے، پہاڑوں کے کاٹنے، سمندروں کے مسخر کرنے

نہیں تھکتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتوں کی ایک دیوار کو کھڑا کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ کبھی بجلی سے ڈرتا ہے، طوفان سے لرزتا ہے، آسمان کو دہشت و خوف سے دیکھتا ہے اور پھر اس قدر ان کے مظاہر و شئون سے مرعوب ہو جاتا ہے کہ اُن کی پرستش و بندگی شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ان کے آگے صرف جھکنے اور عاجزی ہی کے لئے ہوں۔ ان کے تنزل و تسفل کے لئے یہ مثال بھی کافی نہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب کہ دنیا میں پتھر کے ان ٹکڑوں کے لئے جو راستوں میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، عزت ہوتی ہے۔ پر انسان کے لئے کوئی عزت باقی نہیں رہتی۔ وہ انسان ہو کر پتھروں کے آگے ماتھا ٹیکتا، ان کو اپنے آقا اور خداوند کی طرح پوجتا اور اپنی حیات و ممات کو ان کی رضا و غضب میں منحصر یقین کرتا ہے۔ کتا زیادہ سے زیادہ انسان کے آگے جھکتا ہے کہ وہ کتے سے اشرف و اعلیٰ ہے گھوڑا اور ہاتھی انسان کے چاکر بن جاتے ہیں کہ انسان کی عظمت کا مقابلہ نہیں کر سکتے، مگر انسان کتے سے بھی بدتر اور گھوڑے اور ہاتھی سے بھی اسفل ہے کہ اپنے سے اعلیٰ کے آگے نہیں بلکہ اپنے ہی جیسے کے سامنے یا اپنے سے بھی بدتر کے آگے جھکتا اور اوندھا ہوتا ہے۔

تم کسی کتے کو نہیں دیکھو گے کہ وہ کسی کتے کے آگے عاجزی کرے لیکن یہ انسان ہی ہے کہ اپنے جیسے ایک دوسرے انسان کو چاندی و سونے کے تخت پر بٹھاتا ہے اور پھر کتوں کی طرح اُس کے آگے زمین

Marfat.com

پر لوٹتا اور گرد مذلت چاٹتا ہے۔

اعمال انسانی کے اس اختلاف و تضاد اور انفعالات و تاثرات عملیہ کی اس بوقلمونی و رنگا رنگی میں انسانی فطرت اصلیہ کی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔ کچھ نہیں کھلتا کہ یہ عجیب جانور جو سب سے بڑا بھی ہے اور سب سے چھوٹا بھی، اس کی اصلی متاعِ فطرت کیا تھی جو اُسے دی گئی تھی؟ وہ فی نفسہٖ شیطان ہے یا فرشتہ؟ بھیڑیا ہے یا بکری؟ تاریکی ہے یا روشنی؟ نیک ہے یا بد؟ اچھا ہے یا بُرا؟

مسئلہ خیر و شر فطرتِ انسانی

یہ سوال انسان کی اصلی فطرت و جبلت کی نیکی اور بدی کا ہے۔ یعنی کیا بالطبع وہ نیک بنایا گیا ہے یا بد؟ یا دونوں؟ اس کے داخلی جذبات و داعیات کی کشاکش اور خارجی اعمال و نتائج کا میدان تو نور و ظلمت، ملکوتیت و بہیمیت، حسن و بدروئی، علو و تسفل، عظمت و ذلت، نیکی و بدی، دونوں کا مجموعہ نظر آتا ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دراصل وہ کیا ہے؟

دنیا میں ابتدا سے لے کر اب تک اس سوال کے متعلق تین مختلف مذاہب نظر آتے ہیں۔

۱ــــ انسان کی اصلی جبلت و فطرت بدی ہے لیکن باہر کی تربیت اس کو عارضی طور پر خوشنما کر دیتی ہے۔ وہ خصائص فطرت کے اعتبار سے ایک خالص حیوان ہے۔ لیکن تربیت پذیری کے اعتبار سے ان پر فوقیت

رکھتا ہے۔ درخت کی جڑ اور شاخیں متناسب نہیں ہوتیں، لیکن ان کو کاٹ کر اور چھیل کر ہم درست کر لیتے ہیں۔ فطرت کی تمام خلقت کا یہی حال ہے اصل فطرت میں قوام و اعتدال نہیں ہوتا۔ چھیل چھال کر اسے سڈول بنایا جا سکتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ باہر کی صناعی تربیت سے ایک نیا رنگ اپنے اوپر چڑھا لیتا ہے لیکن جب اوپر کا رنگ کمزور ہو جاتا ہے تو اصلی تہ نظر آ جاتی ہے۔ بڑے سے بڑا مہذب انسان بھی غصہ و انتقام میں درندہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مصنوعی رنگ اتر گیا اور اس کی اصلی فطرت ابھر آئی۔

یہ مذہب "مذہب شر" یا "مذہب یاس" ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو شر اور یاس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یونان میں دیوجانس کلبی (ڈائیگونس) اسی فلسفۂ اخلاق کا مشہور پیشوا گزرا ہے۔

۲ ـــــ دوسرا مذہب ان لوگوں کا ہے جو انسان کی فطرت کو بالکل ایک سادہ حالت میں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں نہ تو نیکی ہے اور نہ بدی ہے۔ نہ وہ کانٹوں کی چبھن ہے اور نہ پھولوں کی مہک۔ وہ محض ایک منفعل، اثر پذیر اور نقش انگیز وجود ہے جو اپنے ساتھ کچھ نہیں لاتا مگر دنیا میں آ کر جو کچھ پاتا ہے لے لیتا ہے۔ وہ ایک دامن ہے جس کے اندر سوائے گنجائش و عمق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس میں ہر طرح کا بوجھ بھر لینے کی صلاحیت ہے مگر ابھی کوئی چیز اس میں بھری نہیں گئی ہے۔ اب اگر اس کو پتھر ملا ہے تو اسی کو بھر لے گا، پھول ملے ہیں تو ان کو اٹھا لے گا۔ بہ تشبیہ واضح تر یہ کہ

انسان کی فطرت اصلاً ایک سفید کاغذ ہے۔ اس پر کوئی نقش نہیں ہوتا۔ نہ تو کانٹے کی تصویر ہوتی ہے اور نہ پھول کی۔ اب جو کچھ اس پر بنایا جائے گا بن جائے گا۔

حکمائے یونان میں اس مذہب کا ایک دور رہ چکا ہے۔ معتزلہ نے بھی زیادہ تر اسی کی پیروی کی تھی۔ آج یورپ میں بھی حکمائے اخلاق کا ایک بڑا گروہ یہی کہتا ہے۔

۳۔۔۔۔ تیسرا مذہب جامع خیر و شر ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون ست!

نیکی اور بدی دونوں اس کی فطرت میں موجود ہیں۔ بالقوہ وہ شیطان بھی اور فرشتہ دونوں ہے۔ قوت ملکوتی و بہیمی دونوں رکھتا ہے۔ دنیا میں آکر جس قسم کے خارجی مؤثرات ملتے ہیں، انہی کے مطابق اس کی کوئی ایک قوت نشو و نما پاتی اور بروز کرتی ہے۔ اگر وہ اثرات اس کے لئے مرغوب ہو جاتے ہیں کہ تم نیکی کے لقب سے پکارتے ہو، تو اس کی قوت ملکوتی ابھرے گی اور چمکے گی لیکن اگر برخلاف اس کے بدی کا گرد و غبار چھا جائے گا تو نیکی کی جیب ماند پڑ جائے گی اور بدی کی تاریکی چھا جائے گی۔ اس مذہب کے پیروؤں کے نزدیک انسان کے اندر بالقوہ ملکوتیت و بہیمیت دونوں ہیں۔ مگر ان کا فعل تربیت و تاثرات سے ظہور پکڑتا ہے۔ گویا نیکی اور بدی دو بیج ہیں جن کو انسان اپنے ساتھ دنیا میں لاتا ہے۔ پھر جس بیج کو تربیت و تاثر کا پانی مل جاتا ہے وہی پھولتا پھلتا

اور تناور درخت بنتا ہے۔

دنیائے قدیم و جدید دونوں میں اس مذہب نے بہت ترقی و مقبولیت حاصل کی ہے۔ ارسطو کا بھی یہی مذہب تھا اور تقریباً تمام حکمائے اسلام نے اسی کو قبول کیا ہے۔ ابن مسکویہ جس نے یونانی اخلاق کو سب سے زیادہ مشرح و منظم لکھا ہے، اسی مذہب کا داعی ہے۔ دورِ جدید کے حکمائے اخلاق میں بھی یہی مذہب زیادہ مقبول ہے! امام فخرالدین رازی وغیرہ تمام مفسرین تفسیر قرآن میں اسی مذہب کو پیش نظر رکھتے ہیں اور "وھدیناہ النجدین" اور "فالھمھا فجورھا وتقواھا" وغیرہ آیات کریمہ کی تفسیر اسی مذہب کی بنا پر کرتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ خیر و شر فطرت کے متعلق دنیا کا غالب اور عام اعتقاد یہی ہے اور چونکہ انسانی اعمال و نتائج میں خیر و شر دونوں نظر آتے ہیں، اس لئے ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہی مذہب زیادہ صحیح و احق ہے۔

القرآن الحکیم

قرآن حکیم نے دین الٰہی کا دوسرا نام "العلم" رکھا ہے:

ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءک من العلم۔

اور اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، بعد اس کے کہ تیرے پاس علم یعنی دین الٰہی آ چکا ہے۔

ہر جگہ گمراہ قوموں کے بغی و ضلالت پر ملامت کرتے ہوئے کہا: فما اختلفوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم (جاثیہ ع ۲)

عالمین قرآن کی نسبت کہا:

فی صدور الذین اوتوا العلم — وہ اُن کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا۔

نیز کہا کہ یہ "برہان" ہے، "بصائر" ہے، "نور" ہے، "بصیرت" ہے اور ہر جگہ کفر کو کہا کہ وہ "ظن" ہے "شک" ہے، "تخمین" ہے اور اٹکل کی باتیں اور قیاسات ہیں۔ ما لھم بذالک من علم ان ھم الا یظنون۔ پھر دین الٰہی کے ماننے اور اطاعت کرنے کو "ایمان" کہا اور ایمان والوں کو "مومن"۔ ایمان امن سے ہے اور امن کے معنی "طمانیۃ النفس" اور زوال خوف و شک کے ہیں۔ ان تمام تصریحات سے واضح ہوا کہ دنیا میں علم و یقین صرف ایک ہی ہے اور وہ وحی الٰہی ہے اور اس کے سوا اور جس قدر ادعا علم کے اعلانات ہیں ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نیز یہ کہ "ایمان" کے معنی "یقین" حاصل کرنے کے ہیں اور مومن وہ ہے جس کے پاس "شک" کی جگہ "یقین" ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مومن اور غیر مومن کو "الذین یعلمون" اور "والذین لا یعلمون" اور "الاعمیٰ" اور "البصیر" سے تشبیہ دی۔ یعنی صاحبانِ علم اور بینا اور ارباب جہل اور اندھے۔

اس بنا پر علم اضافی اور محدود تو دنیا کے پاس ہے مگر علی الاطلاق "العلم" قرآن کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور قرآن جس کے پاس ہے وہی دنیا

میں سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑا جاننے والا ہے۔

پس شک وظن کے تمام اختلافات کو راسخ العلم اور اولو البصائر کے آگے عرض کرنا چاہئے کہ وہی ایک حکم حقیقی ہے۔

اس عاجز نے جہاں تک غور کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ خیر و شر فطرت کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ ان تینوں مذہبوں سے الگ ہے اور تمام دنیا میں وہ پہلی آواز ہے جو انسانیت کے شرف فطری و خیریت کو ان تمام مخلوق و اوہام کی پیدا کردہ ذلتوں سے نجات بخشتی ہے۔ ان تینوں مذہبوں میں پہلا مذہب فطرت انسانی کو زمین کی گھاس اور مٹی کے تودوں سے زیادہ حقیر قرار دیتا ہے۔ گھاس حیوانات کی غذا ہے اور مٹی سے دیوار بنائی جا سکتی ہے۔ مگر یہ مذہب کہتا ہے کہ انسانی فطرت میں مضرت کے سوا کوئی نفع نہیں۔ یہ غرور انسان کا اپنی نسبت پہلا باطل فیصلہ تھا۔

اس کے بعد دوسرا مذہب سامنے آتا ہے۔ اور اس کو ایک سادہ صفحہ قرار دیتا ہے جس میں نہ تو نیکی کا نقش ہے اور نہ بدی کا۔ بلاشبہ یہ مذہب انسان کے لئے پہلے مذہب جیسا بے رحم نہیں تاہم یہ بھی اس کی فطرت کو کوئی شرف نہیں بخشتا اور ایک منفعل اور ہر طرح کے اثر کو قبول کرنے والا قرار دے کر چھوڑ دیتا ہے۔

تیسرا مذہب سب سے زیادہ مقبول، سب سے زیادہ عام اور اس بارے میں انسانی علم کی سب سے بڑی جست ہے۔ لیکن وہ بھی پھولوں کے ساتھ کانٹوں کو برقرار رکھتا ہے اور انسان کو فرشتگی اور

شیطنت کا مساوی حصہ بخشتا ہے۔ اس کی غایت تحقیق یہ ہے کہ بالفطرت اس میں نیکی بھی ہے اور بدی بھی۔ پس وہ جس طرح اچھا ہے، بُرا بھی ہے۔ اگر بدی کا پلّہ نہ جھکا تو نیکی کے پلّے کو بھی زیادہ وزن نصیب نہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے اس کی فطرت یہاں بھی شرافت و احترام سے محروم و نامراد ہے۔ وذالک مبلغھم من العلم۔

ان تینوں مذہبوں نے فطرت انسانیہ کی حقیقت کو کھو دیا اور وہ اپنا سراغ نہ پا سکے۔

یہ مذاہب تکملۂ اخلاق اور تمام افکار و آراء انسانی کے لیے ہیں؟ آج جس قدر مذاہب دنیا میں موجود ہیں، ان کا فیصلہ یہی ہے۔ اکثر مذاہب تو یہ ہیں کہ وہ پہلے مذہب کی دعوت دیتے ہیں۔ بعض حالتوں میں اگر ان کے شارحین تاویلات رکیکہ سے کسی بلند درجہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو بھی آخری مذہب سے آگے ان کا قدم نہیں بڑھتا۔

لیکن قرآن یعنی العلم دنیا میں اس لیے نہیں آیا کہ فطرت کے جمال کو اور زیادہ مستور کر دے، بلکہ اس کی دعوت کا اولین مقصد یہ تھا کہ انسانی ضلالت و غفلت نے فطرت و حقیقت پر جو پردے ڈال دیے ہیں، ان کو اس طرح چاک چاک کر دے کہ انسان اپنے ہی آئینہ کے اندر اپنی صورت دیکھ لے۔ پس وہ اولین آواز ہے جس نے سب سے پہلے اس گم شدہ حقیقت کا سراغ بتلایا اور اعلان کیا کہ انسان کی فطرت و جبلت نہ تو محض ایک صفحۂ سادہ ہے، نہ صرف بدی اور شر کی آلایش ہے اور نہ

ہی ملکوتیت اور بہیمیت کا مرکب، بلکہ وہ ایک خالص و کامل نیکی ہے جس میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور کوئی قوت اس کے اندر ایسی نہیں رکھی گئی ہے جس میں بدی اور برائی کا اصلاً بیج ہو۔ وہ صرف نیکی ہی لے کر دنیا میں آتا ہے، نیکی ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور نیکی ہی کے لئے اس کو سب کچھ دیا گیا ہے۔ لیکن وہ دنیا میں آکر اپنی فطری نیکی کی حفاظت نہیں کرتا، اس کی نشو و نما کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور اس کے طبیعی ابھار کو اس طرح دبا دیا جاتا ہے جس طرح کسی پودے پر ایک پتھر رکھ کر اس کی قوت پامال کر دی جائے۔ پس انسان کے اندر جو کچھ ہے وہ خالص نیکی ہے اور جس قدر بھی برائی ہے وہ اس کا کسب خارجی ہے۔ نیکی اس کا فطری عمل ہے اور بدی غیر فطری، خارجی اور یکسر صناعی۔ اگر وہ نیک ہے تو یہ فطرت ہے اگر بد ہے تو یہ تصنع ہے۔ اس کو بیج ایک ہی دیا گیا ہے جو صرف نیکی کا ہے۔ جب وہ ابھرتا ہے تو تم کہتے ہو کہ یہ نیکی ہے۔ جب پامال کر دیا جاتا ہے تو تم کہتے ہو کہ بدی ہے۔ حالانکہ تم نہیں جانتے کہ پھل اور پتوں کا نہ لگنا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ بلکہ درخت کے نشو و نما کے عدم کا نام ہے ــــ!

خدا نے اُس کو روشنی دی ہے اور اُس کے اندر آئینہ رکھ دیا ہے وہ دنیا میں آتا ہے اور باہر کے پردوں سے اندر کی روشنی کو ڈھانپ دیتا ہے۔ باہر کے گرد و غبار سے اندر کے آئینہ کو مکدّر کر دیتا ہے۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ تاریک ہے مگر نہیں سوچتے کہ اس کی اصل روشنی تھی، تاریکی

Marfat.com

نہ تھی۔ اُس نے روشنی کو چمکنے نہ دیا۔ تم جانتے ہو کہ اس کے دامن میں زنگ
اور غبار نہ تھا کیونکہ زنگ اور غبار نہ تھا بلکہ صاف و شفاف آئینہ تھا۔ باہر
سے گرد اڑ رہی تھی۔ اُس کو چاہئے تھا کہ دامن سے ڈھانپ لیتا مگر اُس
نے گرد و غبار کو پسند کیا اور آئینہ کی چمک کی قدر نہ کی۔ اب وہ غبار آلود ہے
کچھ دنوں کے بعد بالکل تاریک ہو کر رہے گا۔ ایک سیاہ ٹکڑا بن جائے گا مگر
اس لئے نہیں کہ اس کے پاس نور نہ تھا بلکہ صرف اس لئے کہ آئینہ کو صاف
نہ رہنے دیا۔

یہی انسان کی وہ فطرت اصلی ہے جس کو قرآن حکیم فطرت صالحہ قرار
دیتا ہے یعنی وہ فطرت جو بالکل اپنی اصلی حالت میں ہے اور باہر کی
کسی چیز سے اس کو آلودہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہی فطرت صالحہ دین الٰہی ہے
یہی دین قیم ہے، یہی دین حنیفی ہے، یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی فطرت اللہ
ہے، یہی صبغۃ اللہ ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں سب سے زیادہ جامع
و صاف نام اسی کا "اسلام" ہے۔

اور اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ انسان کی اصلی فطرت اسلام ہے اور
کفر ایک صناعی اور غیر فطری عمل ہے۔ اگر ایک انسان "مسلم" ہے تو اس
کو یوں کہو کہ وہ اپنی اصلی فطرت صالحہ پر قائم ہے۔ اس کی فطری روشنی نور
دے رہی ہے۔ اس کی فطرت تغیر و تبدیل کو باہر کی کوئی طوفان نہ چھپا سکا
اور وہ ویسا ہی ہے جیسا فطرت نے اسے بنایا تھا۔ لیکن اگر ایک
انسان مسلم نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فطرت حقیقی کا بناؤ بگڑ گیا۔

اس کے اندر کا آئینہ زنگ آلود ہو گیا، گرد و غبار کی تو بر تو تہوں نے اس کو سیاہ کر دیا اور وہ فطرت کی صورت حقیقی کی جگہ ایک مسخ شدہ غیر فطری و مصنوعی جانور بن گیا۔ معصیت سے یہ فطری آئینہ زنگ آلود ہوتا ہے اور کفر زنگ آلودگی کی وہ آخری حالت ہے جب کہ آئینہ بالکل سیاہ ہو گیا اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہ رہی۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ ـــــ اور سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون وغیرہ تصریحات قرآنیہ میں اسی آخری مرتبہ ضلالت کی طرف اشارہ ہے اور ھم قلوب لا یفقھون بھا ـــــ اور ـــــ جعلنا علیٰ قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ ـــــ اور ـــــ کالانعام بل ھم اضل میں اسی فطرت صالحہ کی پامالی اور ایک غیر فطری حالت مسخ و انقلاب کو واضح کیا گیا ہے یہ وقت تفصیل کا نہیں، اشارات پر اکتفا کیجئے۔

اور ٹھیک ٹھیک یہی معنی ہیں مسلم کی اس مشہور حدیث کے جس کی شرح میں عجیب عجیب حیرانیاں لوگوں کو ہو رہی ہیں کہ

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ وابواہ یھودانہ وینصرانہ

دنیا میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اپنی اصل فطرت پر پھر یہودی اُسے یہودی بنا لیتے ہیں اور نصرانی نصرانی۔

ایک دوسری روایت میں ہے :۔ ما من مولود یولد الا وھو

علیٰ ھذہ الملۃ یعنی جس قدر بچے پیدا ہوتے ہیں سب ملت اسلام پر پیدا ہوتے ہیں۔

انسان کی فطرت صالحہ ہی کا نام اسلام ہے اور ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اپنی اصلی اور بے میل فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے پس انسان کا ہر بچہ اسلام پر پیدا کیا گیا۔ اب وہ دنیا میں آتا ہے اور باہر کی ہوائیں اس کے اندر کی روشنی کو تہ و بالا کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہودیت کے اثرات اُس نے پائے، تو یہودیت کا جھونکا اُس کے چراغ فطرت کو گل کر دے گا اگر مجوسیت کا طوفان اٹھا تو اسی میں اس کی کشتیٔ فطرت ڈگمگانے لگے گی پر یہ جو کچھ ہوگا باہر کا اثر و کسب ہے اس کے اندر کی فطرت صرف اسلام تھی یعنی صرف نیکی و خیر تھی۔

تمہید بڑھتی جاتی ہے اور یہ مبحث خود ایک مستقل مبحث ہے اگر اس بارے میں قرآن حکیم کی مزید تصریحات جمع کی جائیں تو صفحوں کے صفحے اسی میں صرف ہو جائیں۔ یہی ہیں ذریت انسانی کے "بلیٰ" کہنے کے جب کہ خدا نے اُن سے پوچھا کہ "الست بربکم؟" کیا میں ہی تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ پس انسان کی فطرت اصلی تصدیق ہے جو اس کے اندر ودیعت کر دی گئی اور اب اگر بلیٰ کی جگہ یعنی تصدیق ربوبیت کی جگہ وہ انکار کرتا ہے تو یہ اُس کی فطرت کی صدا نہیں ہے، ایک غیر فطری عمل ہے۔

اور اسی فطرت صالحہ کا نام قرآن حکیم نے "قلب سلیم" رکھا ہے یعنی وہ دل جو بالکل صحیح و سالم ہو اور اپنی اصلی تندرستی و اعتدال پر قائم ہو۔

Marfat.com

کوئی نیا عارضہ اور بیماری اُسے نہیں لگ گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت فرمایا کہ اذ جاء ربہ بقلب سلیم۔ جب کہ وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم یعنی فطرت صالحہ غیر آلودہ کے ساتھ حاضر ہوئے تم کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم کی یہ فطرت صالحہ وہ تھی جس کو باہر کا کوئی بڑے سے بڑا جلوہ بھی مرعوب نہ کر سکا اور اُس کے اندر کی روشنی چکار اٹھی: انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔

اور یہی وجہ ہے کہ خدا کی شریعت کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس فطرت صالحہ پر انسان نے صناعی و خارجی ضلالت کا جو رنگ چڑھا دیا ہے اُسے دُور کر دے اور اس کی اصلی روشنی پھر چمک اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہدایت الٰہی کو قرآن نے "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کیا اور ضلالت و کفر کو "نسیان" کہا۔ "ذکر" کے معنی حفظ اور یاد کے ہیں، "نسیان" بھولنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ فطرت اصلی کو انسان بھلا دیتا ہے اور اسی کا نام ضلالت ہے۔ پس ضلالت نسیان ہوئی اور ہدایت فطرت اصلی کے بھلائے ہوئے سبق کو پھر تازہ کر دینا اسی لئے اس کو ذکر کہا۔ "نسیان" کی انتہا غفلت ہے۔ غفلت کو قرآن نے منتہائے ضلالت قرار دیا ہے۔ لہم[1] قلوب لا یفقھون بہا، ولہم

---

[1] ان کے دل ہیں جن سے سمجھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے سنتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں (بقیہ ص ۵۳ پر)

اذان لا یسمعون بہا، ولہم اعین لا یبصرون بہا، اولئک کالانعام بل ہم اضل، اولئک ہم الغافلون۔

ایک اور آیت بھی نسیان کے متعلق اس امر پر نظر ڈالتی ہے سُن لو:

الذین نسوا اللہ فانساہم انفسہم	وہ لوگ کہ انہوں نے اللہ کے رشتے کو بھلا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے نفسوں ہی کو بھول گئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسوں کو یعنی اپنی فطرت صالحہ کو بھول گئے کیونکہ فطرت صالحہ تو وہ تھی جس نے کہا تھا بلیٰ یعنی خدا کی ربوبیت اور اس کے رشتہ کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر وہ اس ہستی کے رشتے کو بھول رہے ہیں جس کے آگے فطرت اپنی بلیٰ کہہ چکی ہے تو اس رشتے کو نہیں بھولتے بلکہ اپنی فطرت ہی کو بھلا رہے ہیں۔

عود الی المقصود

بہرحال قرآن حکیم انسان کی فطرت کو خالص نیکی قرار دیتا ہے اور [illegible] سے اس کی فطرت صالحہ کو پہلے بتاتا ہے [illegible]

(بقیہ حاشیہ ۵۲ سے) چونکہ اس قوت سے کام نہیں لیتے اس لئے یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ لوگ وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

تندرستی اور صحت ہے، البتہ وہ دنیا میں آکر بہت سی بیماریاں مول لے لیتا ہے۔ بیماری باہر کا اثر ہے اندر صرف تندرستی ہے۔

سورۂ والتین کا موضوع اصلی یہی حقیقت ہے یعنی اس میں انسان کی فطرت صالحہ کی اسی گم شدہ اصلیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس موضوع کے لئے قرآن نے مفصل درس بھی دیئے ہیں لیکن یہ منجملہ مجمل مگر جامع و حاوی دروس کے ہے۔

گزشتہ صحبت میں یہ مسئلہ ایک حد تک واضح ہو چکا کہ سورۂ والتین کا موضوع اصلی فطرت صادقۂ انسانی کے شرف و خیریت کا اعلان ہے اور یہ بتلانا ہے کہ انسان نے اپنی حقیقت و فطرت کے متعلق جس قدر مایوس فیصلے کئے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ نہ تو اللہ نے اس کی فطرت کو شر اور بدی کے لئے بنایا ہے اور نہ اس کی حقیقت اس قدر حقیر و ذلیل ہے کہ وہ کائنات ہستی کے ہر وجود و ظہور کے آگے جھک جائے اور ان کے کرشموں کے سامنے اپنے تئیں حقیر و لاچار سمجھ لے۔ اگر وہ اپنی فطرت صادقہ کو عمل غیر صالح سے پامال نہ کرے تو وہ دنیا میں بڑی سے بڑی عظمت حاصل کر سکتا ہے۔

اس موقع پر اس قدر اور سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان کا اپنی فطرت صادقہ سے بے خبر رہنا، دراصل اس کی تمام ناکامیوں کی جڑ ہے۔ کائنات عالم کے دائرہ حقیقت کے لئے اس کا وجود بمنزلہ ایک نقطہ و مرکز کے ہے پس جب تک انسان اپنے نفس کی حقیقت کو نہیں پائے گا، وہ تمام

عالم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اور حقیقت کو نہیں پا سکتا تو اپنی تخلیق کی غرض و مقصد کو بھی پورا نہیں کر سکتا۔ سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ وہ سمجھے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس کے لئے ہے، وہ کسی کے لئے نہیں ہے لیکن اپنے شرف و عظمت اور خیریت و حرمت کے احتجاب نے اس حقیقت تک پہنچنے نہ دیا۔ وہ کائنات عالم کے ادنیٰ ادنیٰ جلووں سے مرعوب و ہیبت زدہ ہو گیا اور سمجھنے لگا کہ جب بجلی کی چمک مجھ سے بڑی ہے، سمندر کا طوفان مجھ سے زیادہ قہار ہے، شیر کا پنجہ مجھ سے زیادہ قوی ہے، ہاتھی کا وجود مجھ سے زیادہ عظیم ہے، حتیٰ کہ مچھر کی ڈنک اور رینگنے والے زہریلے کیڑوں کا زہر بھی میرے لئے سخت خوفناک ہے تو پھر میری ہستی کیا ہے؟ اور مجھ میں کون سی بڑائی ہو سکتی ہے؟ اسی خیال کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے اینٹ اور پتھر تک کی پوجا شروع کر دی اور دوسری طرف اپنے وجود کو اس قدر ذلیل سمجھ لیا کہ جھکنے، گرنے، لوٹنے، پوجنے اور بندگی کرنے کے لئے اس کے اندر ایک قوی اور دائمی استعداد پیدا ہو گئی۔ اس صناعی و خارجی ضلالت سے ہر قوت نے غیر فطری فائدہ اٹھایا اور جب چاہا ایک ادنیٰ کرشمۂ قوت دکھا کر اس کے جسم و دماغ کو اپنے آگے جھکا دیا۔

تحقیر و تذلیل نفس انسانی کی یہ انتہائی حالت اسی کا نتیجہ تھی کہ اس نے اپنی فطرت کی خیریت کو نہ سمجھا اور ہمیشہ اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ اس نے چارپایوں کو دیکھا اور سانپوں اور بھیڑیوں کی درندگی و خونخواری پر

نظر ڈالی۔ پھر اسی طرح اپنی نسبت بھی فیصلہ کر لیا کہ اس میں بدی اور بہیمیت کے سوا کچھ نہیں ہے اور اگر نیکی کا جزو ہے بھی تو وہ بدی کے ساتھ ممزوج و مخلوط یعنی ملا جلا ہے۔

یہ تنزل انسانی کی اصلی علت اور انسانیت اعلیٰ اور خلقت کبریٰ کی گم شدگی تھی۔ سورۂ والتین نے اسی کا سُراغ بتلایا ہے پس فی الحقیقت اس کا موضوع انسانیت اعلیٰ کا اعلان ہے۔

انسان کے اندر جو کچھ ہے وہ اس کا نفس ہے۔ باہر جو کچھ ہے وہ آفاق ہے۔ قرآن حکیم نے جا بجا اسے تنبیہ کی ہے کہ اپنے اندر بھی دیکھے اور اپنے سے باہر کو بھی سمجھے یعنی انفس و آفاق دونوں میں تفکر کرے۔

سنریھم ایاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق۔

عنقریب وہ اللہ کی نشانیاں آفاق اور انفس میں یعنی اپنے سے باہر اور اپنے اندر دیکھیں گے۔ یہ مشاہدہ حقیقت اصلی کو اُن پر کھول دے گا اور وہ پائیں گے کہ بلاشبہ دینِ الٰہی کی دعوت حق ہے۔

دوسری جگہ فرمایا وفی انفسکم افلا تبصرون۔ تم اپنے اندر نہیں دیکھتے کہ کیا ہے۔ اگر تم دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ شریعت الٰہی کوئی نئی چیز تم سے نہیں چاہتی۔ تمہاری فطرت اصلی ہی کا ظہور خالص چاہتی ہے اسی کا نام دینِ قیم ہے۔

استشہاد و طریق استشہاد

سورۂ والتین نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور اس پر شہادت پیش کی ہے۔ بیان بمنزلہ دعویٰ کے ہے اور شہادت اس کی دلیل ہے۔ دعویٰ تمہیں معلوم ہو چکا:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم — ہم نے انسان کو بہترین حالت پر پیدا کیا۔

اب دلیل کا حصہ باقی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ دلائل پر نظر ڈالیں اس پر غور کر لینا چاہیے کہ اس غلطی کا اصل سبب کیا تھا جس کو سورۂ والتین دور کرنا چاہتی ہے۔

اس کا اصل سبب اعمال انسانی کی نیرنگی اور بوقلمونی تھی۔ انسان نے جب اپنے آپ کو سمجھنا چاہا تو اپنی فطرت کو نہ دیکھ سکا وہ محجوب و مستور ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اعمال و افعال کو دیکھا اور ان کے اندر ایک عجیب تضاد و اختلاف نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ نیکی اور بدی دونوں باہم دست و گریبان ہیں۔ اگر ایک طرف اس کے نفس کی شرافت کے نازک و لطیف جذبات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف درندگی و بہیمیت کی شورش بھی نظر آتی ہے۔ اگر وہ فرشتوں کی مانند محبت و احسان کی آنکھیں رکھتا ہے تو بھیڑیوں اور بھیڑیوں کی طرح اس کے پاس ظلم و غضب کا پنجہ اور خونریزی و سفاکی کی زہریلی ڈنک بھی ہے۔ اگر ایک طرف بادشاہوں نے زر نگار

تخت اور حکموں اور فرمانروائیوں کی عظمت و کبریائی نظر آتی ہے جو انسانی عظمت و جلال کی شہادتیں دے رہی ہیں۔ تو انہی کے سامنے غلاموں کی پا بزنجیر صفیں بھی دست بستہ کھڑی ہیں جو انسان کو کتے اور بلی سے بھی زیادہ حقیر ثابت کر رہی ہیں کیوں کہ نہ تو کتے نے اپنے جیسے کتے کے آگے سر جھکایا اور نہ بلی نے کبھی بلی کو سجدہ کیا۔

اُس نے دیکھا کہ یہی انسان حاکم بھی ہے محکوم بھی، ساجد بھی ہے مسجود بھی، عالم بھی ہے جاہل بھی، عاقل بھی ہے ابلہ بھی، نیک بھی ہے بد بھی۔ شہنشاہی کا تخت، حکمرانی کا فرمان، فتح مندی کی تلوار، نیکی کی فرشتگی اور سچائی کی قدوسیت بھی وہی ہے اور غلامی کی خاک، محکومی کی ذلت، مقتولی کی گردن، بدی کی شیطنت اور شر کی رذالت بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

یہی انسان ہے جو رات کو دروازوں پر پاسبانی کرتا ہے تاکہ اس کے ہم جنس گھر کے اندر امن سے سوئیں اور یہی انسان ہے کہ دوسری طرف سے آکر مکان میں نقب بھی لگاتا ہے تاکہ اپنے ہم جنسوں کو دکھ اور نقصان پہنچائے۔ اگر عبادت گاہوں کے اندر فرشتے نہیں آتے بلکہ انسان ہی ہوتے ہیں، تو ڈاکوؤں کے جتھوں کے اندر بھی بھیڑیئے جمع نہیں ہوتے بلکہ آدم ہی کی اولاد ہوتی ہے۔

پس اعمال انسانی کی اس رنگارنگی اور نور و ظلمت کے اس اختلاط کو دیکھ کر وہ اس دھوکے میں پڑ گیا کہ جس مخلوق کے اعمال کا یہ حال ہے اس کی فطرت کا بھی یہی حال ہوگا۔ اگر وہ اپنے اعمال کے اندر نیکی اور بدی

اور عظمت و ذلت دونوں رکھتا ہے، تو اس کی فطرت کے اندر بھی نیکی و بدی اور فوز و خسران دونوں ہوں گے۔ اگر وہ اپنے اعمال اور نتائج اعمال کے اندر عظمت کا تخت اور ذلت کی بندگی دونوں جلوے دکھلاتا ہے تو اپنی فطرت کے اندر بھی طاقت و تسلط اور مقہوریت و مخذولیت، دونوں رکھتا ہوگا۔

اس نے اعمال کو دیکھ کر فطرت کے لئے حکم لگانا چاہا اور اس نے افراد کی حالت کو دیکھ کر نوع کے لئے فیصلہ کر دیا۔

اسی غلطی نے اس کے اندر یہ عقیدہ پیدا کیا کہ ہم صرف بڑائی اور نیکی ہی کے لئے نہیں ہیں جیسا کہ بعض افراد نظر آتے ہیں، بلکہ حقیر ہونے اور برے رہنے کے لئے بھی ہیں جس طرح کہ اکثر افراد شہادت دیتے ہیں۔ پس نیکی اور برائی دونوں کے لئے اس میں ایک مایوس قناعت پیدا ہو گئی۔ اور اس غیر صالح قناعت نے عزم اور ہمت کی پیاس کو بالکل بجھا دیا۔ ایک غلام ساری عمر غلامی اور بندگی میں خوش خوش گزار دیتا ہے اور کبھی اس کے اندر یہ حساس پیدا نہیں ہوتا کہ میں بھی ویسا ہی انسان ہوں جیسا میرا آقا۔ پھر میں کیوں صرف بندگی کے لئے ہوں اور یہ کیوں آقائی کے لئے؟ ایک محکوم قوم ویسی ہی خوشی اور سکھ کے ساتھ غلامی کی خاک پر لوٹتی ہے، جس طرح ایک حاکم قوم عزت و عظمت کے تخت پر فرمانروائی کرتی ہے اور کبھی اس کے اندر یہ بیقراری نہیں اٹھتی کہ ہم بھی انسان ہیں، ہمارے پاس بھی وہ سب کچھ ہے جو ان حاکموں کے پاس ہے، پھر ہم کیوں ذلت کے لئے ہیں اور یہ

Marfat.com

بُزدلوں کو دیکھ کر اپنی بزدلی پر وہ ایک طرح کا استدلال کرنے لگا۔ وہ ان سے شہادت لے کر اپنی حالت کو فطری اور نارمل سمجھنے لگا۔ اس عمل استشہاد نے اس کے اندر غلط قسم کی قناعت پیدا کی۔ اس کے احساس کو کند کر دیا۔ ترقی کی طلب بُجھ گئی اور وہ اپنی ذلّت و خواری کو اصلی اور فطری چیز سمجھ کر ایک نام نہاد خوش حالی میں مبتلا ہو گیا۔ غلام کے اندر آقا بننے کا حوصلہ نہیں اٹھتا اس لئے کہ وہ اپنے جیسے غلاموں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ بات میرے ہی لئے نہیں ہے بلکہ سب کے لئے ہے اور اس لئے ایک فطری چیز ہے جس پر صرف صبر ہی کر لینا چاہئے۔ لیکن اس نے غلاموں پر نظر ڈالی اور غلاموں سے اپنی غلامی پر شہادت لی۔ اگر وہ غلاموں کی جگہ آقاؤں کو دیکھتا اور ان سے شہادت لیتا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہیں اور اسی کرۂ ارض کی پیٹھ پر بستے ہیں، تو فوراً اس کا احساس مُردہ زندہ ہو جاتا اور اپنی فطرت کے شرف و حریت کو پا لیتا۔ ایک مزدور کیوں اسی پر قانع ہے کہ اٹھارہ گھنٹے کی محنت کے معاوضہ میں صرف ایک روٹی پا لے؟ اس لئے کہ وہ اپنی ادنیٰ حالت کے لئے اپنے ہی جیسی ادنیٰ حالت کے مزدوروں کو دیکھتا اور ان سے استشہاد کرتا ہے۔ اگر وہ ان سے استشہاد کرتا جن کی وہ مزدوری کرتا ہے تو اس کے اندر بھی ولولۂ عزم و طلب پیدا ہوتا۔ ایک بد انسان کس طرح برائی میں اپنے اندر تسکین و قناعت پیدا کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ وہ بُزدلوں ہی کو دیکھتا ہے اور انہی سے استشہاد کر کے سمجھ لیتا ہے کہ انسان اس لئے بھی بنایا گیا ہے کہ برائی کرے جیسا

کہ سب کر رہے ہیں - اور جب سب کر رہے ہیں تو وہاں ایک اور سہی:

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہد ہم چو توئی یا بہ فسق ہم چو منی

پس حاصل مبحث یہ ہے کہ انسان نے فطرت انسانی کی حقیقت و خیریت کے سمجھنے میں غلطی کی اس لئے کہ اُس نے:

۱ —— اعمال انسانی کو خیر و شر اور عظمت و ذلت کا مجموعہ دیکھا۔

۲ —— پس وہ سمجھا کہ انسان کی فطرت میں بھی خیر و شر اور ذلت و عظمت دونوں ہیں۔

۳ —— اس نے اعمال کی راہ سے فطرت کو دیکھنا چاہا اور افراد کی حالت کو دیکھ کر نوع کو بھی اسی پر قیاس کر لیا۔

۴ —— اسی اعتقاد کا اثر اس کے تمام اعمال حیات میں پڑا جب اُس نے انسانی فطرت کو خیر و شر کا مجموعہ سمجھ لیا تو اُس کے اندر شر و تسفل کی حالت میں ایک گمراہ قناعت پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگا کہ جب بُرائی فطرت ہی میں ہے تو نیکی کا نہ ہونا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر افسوس کیا جائے اور جس کے لئے اچنبھا ہو۔

اس کی یہ حالت دراصل ایک استشہاد و استدلال ہے جو وہ تمام ادنیٰ و سافل حالتوں کے افراد سے کرتا اور عموماً اعمال شر و تسفل کو اپنے سامنے لاتا ہے۔

سورۂ والتین کے مطالب کی ترتیب

سورۂ والتین کا موضوع اور مسئلہ خیر و شر فطرت کے متعلق انسان کی غلطی کے اصلی اسباب معلوم ہو گئے۔ اب دیکھو کہ سورۂ والتین نے اس حقیقت کے اظہار و ثبوت کے لئے مطالب کی ترتیب کیا اختیار کی ہے:

۱ —— اس نے دعویٰ کیا کہ انسان کی فطرت ہم نے نیک و صالح پیدا کی ہے۔ وہ صرف شرف و عظمت کے لئے ہے۔ اس کو بہترین حالت عدل پر ہم نے پیدا کیا ہے اور عدل ہی خیر کی حقیقت ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

۲ —— ساتھ ہی اس نے اس غلطی کا ازالہ کیا جس کی وجہ سے انسان نے اپنی فطرت کے متعلق ایسی عظیم الشان غلطی کی۔ اس کی بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ انسان کی فطرت کے معلوم کرنے کے لئے انسان کے اعمال کو دیکھتا ہے اور برے انسانوں کو دیکھ کر فطرت کی برائی پر استشہاد کرتا ہے —— پس سورۂ والتین نے انسانی اعمال کی عظمت و جبروت کے لئے انسان کی عظمت و شرف سے استشہاد کیا اور یہ کہا کہ تم گرے ہوؤں کو دیکھ کر

ہیں ۔ فطرت کو کیوں گرا ہوا سمجھتے ہو؟ ان کو نہیں دیکھتے جو گرنے کی جگہ بلند ہوئے یہ لوگ ہیں جو فطرت صادقہ کو قائم رکھ کر بلند ہوئے۔ وہی لوگ ہیں جن کی طرف والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین کے تین جملوں میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہی وہ انعام یافتہ الٰہی گروہ ہیں جن کی راہ صراط مستقیم ہے اور جن کی راہ کی طلب سورۂ فاتحہ میں سکھائی گئی ہے۔ صراط الذین انعمت علیھم۔ ان کی راہ جن پر خدا نے انعام کیا۔ یہی حزب اللہ ہیں یہی اولیاء اللہ ہیں یہی خیر البریہ ہیں یہی انبیاء ہیں اور یہی اصحاب الجنۃ ہیں۔

۲ ـــــــ رہا اعمال انسانی کی بوقلمونی اور خیر و شر کا سوال تو یہ اس لئے نہیں ہے کہ انسان کی فطرت بُرائی ہے۔ اس کی فطرت تو عدل و خیر ہی ہے البتہ وہ جب اس کو ضائع کر دیتا ہے اور اعمال سافلہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو جس طرح اس کی خلقت سب سے اعلیٰ تھی اسی طرح اس کا اکتساب عمل اس کو سب سے زیادہ ادنیٰ بھی بنا دیتا ہے حتیٰ کہ اپنی حقیقت انسانی کو مسخ کر کے بسا اوقات چارپایوں اور درندوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ تم یہ حالت مسخ دیکھ کر کہتے ہو کہ یہ فطرت ہے مگر نہیں سمجھتے کہ فطرت نہیں خارج کا کسب و عمل ہے۔ پس اعمال انسانی میں خیر و شر اور عظمت و تسفل جو تمہیں نظر آتا ہے اس میں تفریق کرو۔ نیکی و عظمت اس کی خلقت ہے اور شر و تسفل اس کی ضلالت عمل اور ضیاع فطرت۔ یہ اس کا عمل ہی ہے جس نے اسے چارپایوں سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔ ثم رددناہ اسفل سافلین۔ اسفل سافلین یعنی ادنیٰ سے بھی ادنیٰ تر حالت تک گرے ہوئے وہی ہیں جن کا نام مغضوب

وضالین ہے۔ پھر حزب الشیطان، اولیاء الطاغوت، شر البریہ، الاعمیٰ اور صحاب النار بھی وہی ہیں۔

۴ ـــــ یہ غلطی اس لئے ہے کہ تم اللہ کے قانون جزا و مکافات سے بے خبر ہو۔ اس کا قانون ہے کہ ہر بیج پھل لاتا ہے اور اسی طرح انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ زہر جب کھایا جائے گا انسان مرے گا اور معصیت جب کبھی کی جائے گی عذاب آئے گا۔ پس اعمال کے جزا ہی سے تمام نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اگر تمہارے اعمال فطرت صالحہ یعنی دین الٰہی کے مطابق ہیں اور تم نے اس کو ضائع نہیں کیا ہے تو تم اپنی فطری بڑائی اور نیکی حاصل کرو گے۔ اگر تم نے ضائع کر دیا تو پھر تم مسخ ہو جاؤ گے اور تم سے بُرا جانور زمین کی پیٹھ پر اور کوئی نہ ہوگا۔ جانور نے اپنی اصلی فطرت کو ضائع نہیں کیا وہ سافل ہے۔ تم نے اپنی فطرت ہی کو ضائع کر دیا پس تم سافلوں سے بھی اسفل اور بد سے بھی بدتر ہو گئے۔

۵ ـــــ پس جن لوگوں نے اپنی فطرت کو عمل غیر صالح سے ضائع کر دیا وہ انسانیت سے گر گئے مگر جنہوں نے ایمان باللہ سے انکار نہ کیا اور ایسے اعمال اختیار کئے جو صالح ہیں اور اس لئے نور فطرت کو قائم رکھنے والے اور چمکانے والے ہیں، سو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب انسانیہ تک فائز ہوں گے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ اس دوسری جماعت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے عمل صالحہ کا درخت ہمیشہ پھل دے گا۔ ان کے نتائج حقہ کی برکتیں اور نعمتیں کبھی بھی ختم نہ ہوں گی۔ وہ اسفل سافلین کی حالت میں نہ ہوں گے کہ

فنا اور ہلاکت ان پر طاری ہو۔ وہ "شجرۂ خبیثہ" نہیں ہیں بلکہ "شجرۂ طیبہ" ہیں۔ لہٰذا فرمایا: فلھم اجر غیر ممنون۔

اصل تفسیر

اب اصل سورت کی یک جا تلاوت کرو:

والتین والزیتون، وطور سینین وھذا البلد الامین
لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ
اسفل سافلین۔ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات
فلھم اجر غیر ممنون۔ فما یکذبک بعد بالدین
الیس اللہ باحکم الحاکمین۔

انجیر اور زیتون، طور سینا اور مکہ معظمہ شاہد ہیں کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا۔ پھر اس کو بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا مگر وہ لوگ کہ ایمان لائے اور عمل صالح کئے تو ان کے اعمال کے نتائج صرف بہتری ہی کے لئے ہیں۔ ان کے عمل صالح کا بدلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ ہمیشہ پھل دے گا۔ پس اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد کون ہے جو اعمال کے نتائج سے انکار کرے گا اور اس بارے میں رسول کی تعلیم کو جھٹلائے گا؟ کیا سب سے بڑا حکم کرنے والا خدا ہی نہیں ہے؟

جس کے قانون جزا و سزا میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

تفصیل استشہاد

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد دین الٰہی کا سلسلہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور ظہور اسلام اسی کا آخری مکمل ظہور ہے۔ حضرت ابراہیم کی نسل سے بنو اسرائیل پیدا ہوئے جن کے انبیاء کے بعد حضرت موسیٰ کی دعوت کا ظہور ہوا اور انہوں نے بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے نکال کر عزت و خلافت کے درجہ پر پہنچا دیا۔ ان کے بعد جب بنی اسرائیل نے پھر اللہ کے احکام سے سرتابی کی اور اصلاح کی جگہ افساد کا طریق اختیار کیا تو روز بروز تنزل و تسفل میں مبتلا ہونے لگے پس انبیاء سے تجدید دین کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ پیہم ان کی اصلاح کرتے رہے لیکن سلسلۂ تنزل بھی برابر چلتا گیا حتیٰ کہ وراثت الٰہی سے بنو اسرائیل محروم ہو گئے اور ان پر [illegible] اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا ظہور ہوا [illegible] انسان ایمان لائے لیکن اللہ نے انہی [illegible] کو یہ درجہ دیا کہ ان کی دعوت و تبلیغ [illegible] مسیحی مذہب تشکیل کیا۔

پس انسان نے اعمال [illegible]

ہونے

۱ ـــــ دین الٰہی کی وہ بنیاد جو بیابان حجاز میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے ڈالی اور اس کی اینٹیں رکھتے ہوئے اُمّت مسلمہ کے ظہور کی دُعا مانگی :۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسماعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (بقرہ ع ۱۵)

اور جب حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں رکھ رہے تھے، تو ان کی زبانوں پر یہ پاک دُعا جاری تھی۔ اے پروردگار! ہمارے اس کام کو قبول کر لے تو دُعاؤں کا سننے والا ہے اور تو ہماری نیتوں کو خوب جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو قبول کیا۔ نسل اسماعیلی سے اُمّت مسلمہ کا ظہور ہوا اور وہ آخری معلّم ربّانی آگیا جس نے تعلیم کتاب و حکمت اور تربیت و تزکیۂ الٰہی سے جماعت مومنین پیدا کر دی۔

۲ ـــــ دعوت موسوی کی وہ روشنی جو طور سینا پر چمکی اور وادی ایمن کے بقعۂ مبارکہ سے انی انا اللہ رب العلمین کی صدائے حق اٹھی :

فلما اتٰھا نودی من شاطیٔ الوادی الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یٰموسیٰ انی انا اللہ رب العٰلمین۔

پس جب موسیٰ کوہ طور کے پاس پہنچے تو وادی ایمن کے کنارے

کہ زمین کا ایک مبارک حصہ تھا، درخت سے ندا اٹھی اے موسیٰ میں ہوں تمام جہانوں کا پروردگار!

یہی کوہ طور کی وادی ایمن کی روشنی تھی جس نے بنو اسرائیل کو ظلمت تنزل و تسفل سے نجات دلائی اور عظمت و خلافت الٰہی کے درجے تک مرتفع کیا:

۳ ـــــ دعوت مسیحی کا وہ ظہور، جو سلسلۂ اسرائیلی کا آخری ظہور تھا اور جو بیت المقدس کی سرزمین میں ہوا:-

فآمنت طائفة من بنی اسرائیل وکفرت طائفة فایدنا الذین آمنوا علیٰ عدوھم فاصبحوا ظاھرین۔

پس بنو اسرائیل کی ایک جماعت اس پر ایمان لائی اور ایک جماعت نے انکار کیا۔ مومنوں کو ہم نے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان والوں کی کامیابی اور فتح مندی ظاہر ہو گئی۔

قرآن حکیم کی مخاطب جو جماعتیں تھیں، ان کی معلومات میں بھی انسانی عظمت و تقدیس کے بالاتفاق یہی تین ظہور تھے۔ اہل کتاب حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا تھے اور مشرکین مکہ کا بڑا ادعائی شرف یہ تھا کہ اپنے تئیں حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کریں۔

پس سورہ والتین میں سعادت انسانی کے انہی تین ظہوروں سے انسان کی فطرت صالحہ و عظمت و شرف پر شہادت لائی گئی ہے "تین" اور "زیتون" سے مقصود سرزمین شام ہے جہاں حضرت مسیح کا ظہور ہوا اور

تمام انبیاء مجددین اسرائیل کا مقام ظہور ہے۔ طور سینین سے اشارہ دعوت موسوی کی طرف ہے جس کی تجلی کا مطلع اسی مقدس پہاڑ کا دامن تھا۔ "بلد امین" یعنی ہمیشہ امن میں رہنے والا گھر خانہ کعبہ ہے اور اس میں اشارہ حضرت ابراہیم کی دعوت مؤسسۂ ابراہیمیہ اور اس کے نتائج کی طرف ہے۔

استشہاد کی ترتیب شاخ سے اصل کی طرف، نسل سے مورث کی طرف، فاضل سے افضل کی طرف اور حسن سے احسن کی طرف ہے۔ یعنی ظہور سعادت انسانی کے اس سلسلہ میں افضل ترین بنیادی مرتبہ دعوت ابراہیمی کا ہے۔ اس کے بعد مرتبۂ قیام شریعت موسوی کا۔ اس کے بعد مرتبہ تجدید انبیاء بنی اسرائیل کا عموماً اور حضرت عیسیٰ کا خصوصاً (علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) پس ترتیب جڑ سے شاخ کی طرف نہیں ہے بلکہ شاخ سے جڑ کی طرف ہے اور اس میں بالترتیب تینوں درجوں کے مراتب یکے بعد دیگرے ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ چونکہ سب سے آخری ظہور مسیحی سب سے زیادہ قریب تھا، اس لئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد اس سے اعلیٰ مرتبہ دعوت موسوی کا تھا، پس اس کا ذکر کیا۔ پھر سب سے اعلیٰ ترین مرتبہ بمنزلہ اصل وحقیقت الحقائق کے مقام خلت کبریٰ حضرت ابراہیم کا تھا۔ پس اس پر مدارج ثلاثہ ختم ہو گئے۔

تین وزیتون

"تین وزیتون" سے سرزمین شام کا مراد لینا بالکل واضح ہے:-

Marfat.com

۱ ـــــ "طور سینین" اور "بلد امین" دونوں میں اشارہ اس سرزمین کی طرف کیا گیا ہے جہاں اُن کی دعوتوں کا ظہور ہوا۔ پس معلوم ہوا کہ اس صورت میں سرزمین کی طرف اشارہ کر کے اس سرزمین کی مشہور دعوت و اُمت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اس بنا پر "تین و زیتون" میں بھی اشارہ کسی سرزمین ہی کی طرف ہوگا۔ جیسا کہ مابعد کی دو شہادتوں میں ہے۔

۲ ـــــ دنیا کی تمام سرزمینوں میں اس وقت بھی جب کہ قرآن حکیم نازل ہوا اور اب بھی جب کہ ملکوں کی طبعی پیداوار کی فہرست ہمارے سامنے موجود ہے، انجیر اور زیتون ایک مخصوص پیداوار سرزمین شام کی ہے۔ جس کثرت کے ساتھ اور جس قدر اعلیٰ درجہ کی یہ دونوں چیزیں وہاں ہوتی ہیں، کہیں نہیں ہوتیں۔ زیتون کا تیل شام کی عام غذا ہے۔ گھی کی جگہ عام طور پر اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی اعمال کا اب تک یہ ایک مقدس جزو ہے۔ ان کے تمام مذہبی رسوم میں اسی تیل کو "مقدس تیل" کہا جاتا ہے۔ روم کے تمام عیسائی بادشاہ جب تخت نشین ہوتے تھے تو مقدس تیل ان کے سینے پر لگایا جاتا تھا اور کہتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان کا اتباع ہے۔ آج تک تاج پوشی کی رسم میں ایک پیالی روغن زیتون کی بھی رکھی جاتی ہے۔ قطع نظر ان تمام خصوصیات کے، اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تمام عرب میں یہ دو چیزیں شام کی مخصوص و ممتاز پیداوار سمجھی جاتی تھیں اور اس قدر مشہور تھیں کہ بچہ بچہ جانتا تھا۔ اشارہ کے لئے کافی ہے۔

۳ ـــــ پس جب تین و زیتون کا اشارہ بھی کسی ملک کی طرف ہونا چاہئے

Marfat.com

اور وہ شام کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر یہ ظاہر ہے کہ شام کا سب سے بڑا آخری ظہور حق حضرت عیسیٰ کی دعوت ہے اور ساتھ ہی یہ سرزمین تمام اسرائیلی انبیاء مجددین کے ظہور کا بھی گھر ہے۔

نیز چونکہ اس کے بعد ہی دعوت موسوی کی طرف اشارہ موجود ہے اس لئے ربط بھی یہی چاہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی دعوت کی طرف بھی اشارہ ہو۔

۴ ——— سب سے زیادہ یہ کہ تین اور زیتون کی تفسیر کے متعلق صحابہ کرام و تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جو روایات موجود ہیں، ان سب پر مجموعی نظر ڈالنے کے بعد یہی تفسیر مرجح ثابت ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی سب سے زیادہ صحیح تفسیر وہی ہے جو صحابہ کی تفسیر سے معلوم ہو کہ ان کے علوم حامل وحی سے براہ راست ماخوذ تھے۔

امام ابن جریر طبری نے تمام روایتیں جمع کر دی ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے سب سے پہلے حضرت کعبؓ کا ایک قول سامنے آتا ہے کہ

التین مسجد دمشق	تین مسجد دمشق ہے اور زیتون
والزیتون بیت المقدس	بیت المقدس۔

پھر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی نسبت سے اس قول کی شہرت ثابت ہوتی ہے کہ:

الزیتون بیت المقدس	یعنی زیتون بیت المقدس ہے

لیکن اس کے بعد بعض کبار تابعین کی تصریحات آتی ہیں جنہوں نے

اس امر پر زور دیا ہے کہ "ھو تینکم و زیتونکم" یعنی تین اور زیتون سے یہی انجیر اور زیتون مراد ہے جو تم استعمال کرتے ہو اور کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔ حضرت حسنؓ، عکرمہؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ وغیرہ سب نے یہی کہا ہے۔

اب ان دونوں تفسیروں کو جمع کرو۔ جن صحابہ سے اس قول کو شہرت ہوئی کہ تین اور زیتون سے مراد مسجد دمشق اور بیت المقدس ہے اُن کا مقصود یہ نہ تھا کہ دمشق کی کسی عمارت کا نام تین ہے اور بیت المقدس کا نام زیتون، بلکہ یہ واضح کرنا تھا کہ تین و زیتون میں اشارہ سرزمین شام کی طرف ہے کیونکہ وہاں ان دو چیزوں کی پیداوار کثرت ہوتی ہے اور یہ اس کے خصائص میں سے ہیں۔ پس زیتون یعنی بیت المقدس سے مطلب یہ تھا کہ زیتون میں اشارہ بیت المقدس کی طرف ہے۔

لیکن بہت سے لوگوں کو اس میں غلطی ہوئی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ طور سینا کی طرح زیتون بھی بیت المقدس کے کسی پہاڑ کا نام ہے اور پھر طرح طرح کی مزید تاویلیں اس میں بڑھ گئیں۔ یہ حال دیکھ کر بعض اجلہ تابعین نے غلطی کو دور کرنا چاہا اور زور دے کر کہا کہ "ھو تینکم و زیتونکم" تین اور زیتون کسی پہاڑ یا ملک کا نام نہیں ہے۔ وہی انجیر، زیتون کا درخت ہے جو تم استعمال کرتے ہو۔ گویا انہوں نے واضح کیا کہ تین و زیتون سے اس کی جگہ پیداوار مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ خود اس سرزمین کا نام ہی تین و زیتون ہو۔

چنانچہ امام ابن جریرؒ کا بھی قریب قریب یہی خیال ہے۔ تمام

روایتیں جمع کر کے لکھتے ہیں:

والصواب من القول فی ذالک عندنا من قال التین هو التین الذی یؤکل والزیتون هو الزیتون الذی یعصر منه الزیت لان ذالک هو المعروف عند العرب. الا ان یقول قائل اقسم ربنا بالتین و الزیتون والمراد من الکلام القسم بمنابت التین ومنابت الزیتون فیکون ذالک مذهبا.
(جلد ۳: ۱۵۴)

اس بارے میں ہمارے نزدیک انہی لوگوں کا قول ٹھیک ہے جنہوں نے کہا کہ تین وہی تین ہے جو کھایا جاتا ہے۔ اور زیتون وہی درخت ہے جس سے تیل نکلتا ہے کیونکہ عرب میں یہ معروف تھا اور اس نام کے کسی پہاڑ کو وہ نہیں جانتے تھے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کہے کہ اللہ نے تین اور زیتون کی قسم کھائی مگر مقصود اس سے تین و زیتون کے پیدائش کے مقامات کی قسم کھانا ہے۔ سو اگر یہ کہا جائے تو یہ ایک مذہب ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ تین و زیتون سے یہی پھل اور درخت مراد لیتے ہیں ان کو صرف اس سے انکار ہے کہ کسی ملک یا پہاڑ کا نام تین و زیتون نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے لیکن اس سے وہ انکار نہیں کرتے

کہ ان چیزوں سے ان چیزوں کی پیدائش کی سرزمین مراد نہ ہو۔

احسن تقویم

"احسن تقویم" میں "تقویم" ٹھیک ٹھیک بمعنی "تعدیل" کے ہے یعنی ہم نے انسان کو بہترین قوام و عدل پر پیدا کیا۔ تعدیل خلقت میں جسم اور فطرت، ظاہر و باطن سب داخل ہیں اور جن صحابہ و تابعین سے "فی اعدل خلق واحسن صورۃ" بکثرت منقول ہے اور نیز جو صحابہ استقامت صورت و جسم کو پیش کر کے حقیقت تعدیل خلقت کو سمجھانا چاہتے ہیں ان سب کا مقصود یہی تعدیل فطرت ہے اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ کسی نے کہا کہ انسان کا قد دیکھو، کسی نے کہا جسم کا تناسب دیکھو، کوئی اور آگے بڑھا اور کہا کہ خلقت کی تعدیل معنوی پر بھی نظر ڈالو۔ تعدیل کا ایک بڑا نمونہ انسان کا قد ہے۔ اس کی بڑی نمود اس کے تناسب اعضاء و جسم میں ہے اور پھر اس کی فطرت عدل و قوام صالح پر پیدا کی گئی ہے۔ پس سب نے ایک ہی حقیقت کو واضح کیا اور اسی کو مختلف تعبیرات سے سمجھانا چاہا۔

سورۃ القدر

Marfat.com

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا
لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ
شَهْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا
بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ
مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا۔ اور تم سمجھے کہ لیلۃ القدر کیا شے ہے؟ لیلۃ القدر ایک عہد رحمت و دور برکت ہے جو ہزاروں مہینوں سے افضل ہے۔ ملائکہ سماوی و روح الٰہی کا اس میں ہر طرف سے نزول ہوتا ہے۔ سلام اس پر ہے یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے۔

(الہلال ۵، ۱۲ اگست ۱۹۱۴ء)

عالم تقدیر خاموش نہیں ہے۔ وہ ایک امام ناطق ہے۔ اس نے مجموعی طور پر تمام عالم کی قسمت کا فیصلہ ازل ہی میں کر دیا تھا، لیکن اشخاص و اقوام کی تقدیر کا فیصلہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔

کارکنانِ قضا و قدر بہت سی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کر چکے تھے مگر ایک بادیہ نشین قوم پہاڑوں کے دامن میں دبی پڑی تھی۔ انہی پہاڑوں کے غار سے آتشیں شریعت کا ایک شرارہ اٹھا اور دفعۃً خرمنِ جہل و ضلالت پر برق خاطف بن کر گرا۔ اس مردہ قوم کی سوئی ہوئی تقدیر نے مدت کے بعد ایک خاص رات میں کروٹ بدلی۔ اس لئے اس رات کو لیلۃ القدر کہا گیا کیونکہ اسی رات میں اس کے کارنامہ اعمال کو قرآن حکیم کے ذریعہ سے معین و مقدر کر دیا گیا تھا۔

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر   ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا

سیرۃ القدر: لیلۃ الشرف والفضل و لیلۃ التقدیر والتقدیر

اقرب (احکام القرآن لابن عربی)

یہاں فرمایا کہ قرآن کریم لیلۃ القدر میں اُترا اور سورۂ بقر میں فرمایا کہ رمضان میں۔ شھر رمضان الذی انزل فیہا القرآن۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر سے رمضان ہی کی رات مراد ہے۔ نزول قرآنی سے مقصود یہ ہے کہ نزول کا آغاز لیلۃ القدر اور رمضان المبارک میں ہوا ورنہ یہ ظاہر ہے کہ پورا قرآن نجماً نجماً ۲۳ برس میں نازل ہوا ہے۔

"قرآن" اور "الکتاب" کا اطلاق جس طرح کُل پر ہوتا ہے اسی طرح اس کے ایک جزو پر بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن کے ہر ٹکڑے کو اللہ نے قرآن اور الکتاب کہا ہے۔

لیکن بعض مفسرین کو خیال ہوا کہ "انا انزلناہ فی لیلۃ القدر" سے مقصود پورے قرآن کا نزول ہے۔ اس لئے انہوں نے طرح طرح کی تاویلیں کیں۔ مثلاً کہا گیا کہ قرآن کریم رمضان کی بیس راتوں میں جبرائیل علیہ السلام کو دیا گیا اور انہوں نے بیس سال کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ لیکن قاضی ابوبکر ابن عربی لکھتے ہیں:

> ومن جہالۃ المفسرین انہم قالوا ان السفرۃ القتہ الی جبریل فی عشرین لیلۃ والقاہ جبریل الی محمد علیہما السلام فی عشرین سنۃ وھذا باطل لیس بین جبریل وبین اللہ واسطۃ ولا بین جبریل ومحمد علیہما السلام واسطۃ۔ (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۳۱۷)

اور مفسرین کی یہ جہالت ہے جو وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم پہلی
راتوں کے اندر خدا نے جبریل علیہ السلام کو دیا اور انہوں
نے تیس سالوں کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا سو
ایسا کہنا بالکل باطل ہے۔ نہ تو خدا اور جبریل میں کوئی واسطہ
ہے اور نہ جبریل اور آنحضرت علیہما السلام میں کوئی واسطہ۔

عربی زبان میں متکلم کے لئے "نی" و "انا" کی دو ضمیریں ہیں جو ترتیب
"واحد متکلم" اور "جمع متکلم" کے لئے مستعمل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت
آدم علیہ السلام کو دنیا کی نشاۃ اولیٰ کا موسس بنانا چاہا تو فرمایا:

انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے
والا ہوں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے معمولی صیغہ واحد متکلم کا استعمال
کیا ہے۔ کیونکہ اشیاء و امثال کا پیدا کرنا اس کی قدرت کاملہ کے نزدیک کوئی
غیر معمولی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن عطاء واردات کی نشاۃ جدیدہ دنیا کے
لئے باعث صد رحمت و برکت تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جب کسی پیغمبر کو اس
نشاۃ حقیقیہ کا ذریعہ بنایا ہے تو اس موقع پر اپنے لئے ضمیر جمع متکلم کا
صیغہ استعمال کیا ہے جو واحد کے لئے تعظیم و شوکت کا پہلو رکھتا ہے۔ یہ
تعظیم درحقیقت اس جدید روح سعادت و ہدایت کی اہمیت و عظمت
کو نمایاں کرتی ہے جو دنیا میں ظہور پذیر ہونا چاہتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے دنیا کا قالب از سر نو بنا دیا تھا

لیکن وہ رُوح سے یعنی ترقی یافتہ دینِ الٰہی کی حقیقی رُوح سے خالی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ امانت دے کر دنیا کی طرف بھیجا جو ایک عظیم الشان رُوحانی انقلاب تھا پس ضمیر تعظیمی سے اس کا اظہار کیا:

"انا ارسلنا نوحا۔ — ہم نے نوحؑ کو بھیجا۔

لیکن یہ رُوح امتدادِ زمانہ سے فرسودہ ہو گئی تھی بلکہ سچ یہ ہے کہ بالکل مُردہ ہو گئی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعہ اس رُوح مُردہ کو، اس گلی سڑی مردہ کو، اس بخت خفتہ کو پھر زندہ کیا، شگفتہ کیا، بیدار کیا۔ یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ جس نے نقشۂ عالم کو یکسر پلٹ دیا تھا۔ پس ہمیشہ اس کی اہمیت بھی ضمیر تعظیمی کے پیرایہ میں نمایاں کی گئی۔

انا نحن نزلنا الذکر (۱۵:۹) — ہمیں ہیں کہ ہم نے اپنے ذکر کو نازل کیا۔

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر — ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔

اسی کتاب ذوالخطر والبال کو خدا نے کوثر بھی کہا ہے کہ وہ مایۂ خیر کثیر ہے۔

انا اعطینٰک الکوثر — ہم نے تم کو کوثر یعنی قرآن عطا فرمایا۔

یہاں بھی قرآن کا ذکر متکلم جمع تعظیمی سے کیا:

اسی کے ذریعہ دینِ ابراہیمی زندہ ہوا ہے۔ اس لیے اس تیغ تیز کے عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی سب سے بڑی یادگار قربانی کے قائم کرنے کا حکم دیا۔

فصل لربک وانحر تو اپنے خدا کی نماز پڑھ اور قربانی کر۔

اللہ تعالیٰ نے اسی دین کے ذریعہ ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اور ذکرِ عظیم کو قائم رکھا۔

وجعلنا لهم لسان صدق علیا اور ہم نے اُن کے ذکرِ خیر کو بلند و باقی عطا کی۔

آنحضرت کا ذکرِ جمیل بھی اسی کی برکت سے عاشر انداز عالم روح وایمان ہے۔ ورفعنا لک ذکرک اسی لیے ان دونوں مقامات میں نون جمع متکلم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

مذہب کی پاک روح مردہ ہو گئی تھی لیکن اس رات میں اس کا دوبارہ ورود اور حیات ابدالآباد ہوا — وہ کلمۂ عالم سے عالمِ شہود میں آگئی۔

تنزل الملائکۃ والروح فیہا باذن ربہم

اس رات میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں۔

فرشتے اور روح اس رات میں اترتے ہیں مگر بتدریج پورے ایک مہینے میں اترتے ہیں کیونکہ دنیا کا داعی وقفہ ان برکات وانوار کے ہمیشے

کی وسعت نہیں رکھتا۔

دامانِ نگہ تنگ، گلِ حسنِ تو بسیار
گل چینِ نگاہ تو ز دامان گلہ دارد

لیکن یہ ملائکہ کیا ہیں؟ اور اس روح کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے خود اسی آیت میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ "من کل امر سلام" یعنی وہ ملائکہ اور روح امن اور سلامتی ہیں جو دنیا کو یکسر امنیت و سلامتی کی برکتوں سے معمور کر دیتے ہیں۔

یہ سکون، یہ اطمینان کامل، یہ سلامتی، یہ امن عام جو ہم پر آسمان سے اترا صرف عرب کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ وہ مشرق و مغرب دونوں کو محیط ہے۔ ہمارا آفتاب اگرچہ مغرب سے طلوع ہوا تھا جو ہمارا قبلۂ ایمان ہے۔ لیکن اس کی شعاعوں نے مشرق کے افق کو بھی روشن کر دیا جہاں سے دنیا کا سورج نکلتا ہے اور جہاں سے صبح کا ستارہ طلوع ہوتا ہے۔

ھی حتیٰ مطلع الفجر — وہ امن و امان کا پیغام صبح کے طلوع ہونے کی جگہ تک یعنی مشرق تک پہنچ جائے گا۔

دنیا نے اس وعدے کی صداقت کو دیکھ لیا جب خدا کے پاک فرشتے یعنی قرآن نے مشرق و مغرب دونوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیا ان اللہ علی شئ محیط۔

امن عام کا یہ پیغام کیا ہے؟ اور وہ کیوں کر مشرق و مغرب تک پہنچایا جائے گا؟

قرآن حکیم نے دوسری آیتوں کے ذریعہ اس نکتہ کو حل کر دیا ہے۔

انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیھا یفرق کل امر حکیم امرا من عندنا انا کنا مرسلین رحمۃ من ربک انہ ھو السمیع العلیم (۴۴: ۲)

ہم نے قرآن کو ایک مبارک رات میں اتارا کیونکہ ہم دنیا کو اس کی مخالفت کے نتائج سے ڈرانے والے تھے۔ تمام انقلابات الٰہیہ جو حکمت و مصلحت عالم پر مبنی ہیں اسی رات میں طے پاتے ہیں۔ ازاں جملہ قرآن کا نزول جو اسی رات میں شروع ہوا نیز ہمیں اپنا رسول بھیجنا مقصود تھا جس کا ظہور اللہ کی رحمت کا نزول ہے۔

اب ان دونوں سورتوں کے تطابق و تشاکل پر غور کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ قدر میں فرمایا: انا انزلناہ فی لیلۃ القدر، اور یہاں فرمایا: انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ۔ اسی لئے یہ دونوں راتیں ایک ہی ہیں۔ وہاں فرمایا تھا: تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر سلام اور یہاں فرمایا: فیھا یفرق کل امر حکیم امرا من عندنا اس بنا پر یہ امر سلام اور امر حکیم جس کی تنزیل و تقسیم لیلۃ القدر میں اللہ کے حکم سے کی گئی ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ امر سلام اور امر حکیم کیا چیز ہے؟ دوسری آیتوں نے اس کی بھی تفسیر کر دی ہے۔

الٓرٰ تلک اٰیٰت الکتٰب الحکیم اکان للناس عجباً

ان اوحینا الی رجل منھم ان انذر الناس وبشر

الذین اٰمنوا ان لھم قدم صدق عند ربھم؟

یہ قرآن حکیم کی آیات ہیں۔ پھر کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے

اُنہی میں سے ایک آدمی پر وحی کی تاکہ وہ لوگوں کو ڈرائے

اور مومنوں کو اس بات کا مژدہ سنائے کہ خدا کے تخت کے

نیچے ان کا قدم جم گیا ہے؟

اس سے یہ "امرِ حکیم" اور یہ "امرِ سلام" خود قرآن کریم ہے جو لیلۃ القدر

میں نازل کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر میں قرآن حکیم کی چند خصوصیات کا اجمالی ذکر

فرمایا تھا لیکن اس آیت میں وہ خصوصیتیں بہ تفصیل بیان فرمائی ہیں۔

سورۂ قدر میں فرمایا تھا کہ "وہ سُورج کے طلوع ہونے کی جگہ تک پھیل

جائے گا" یہ نہایت مجمل طرزِ خطاب تھا۔ سورۂ دخان میں اس کی تفسیر بھی کردی

فیھا یفرق کل امر حکیم امرا من عندنا "یعنی قرآن حکیم کی آیتیں ہمارے

حکم سے ایک پیغمبر پر تقسیم کی جاتی ہیں تاکہ وہ دنیا کے سامنے ان آیتوں کو لے

کے جائے اور ہر شخص کے آگے اس خوانِ کرم کو بچھا دے تاکہ ہر شخص اپنا

حصہ لے لے۔ انا کنا مرسلین رحمۃ من ربک "لیکن دنیا غفلت کی

نیند میں سو رہی تھی اس لئے یہ ابرِ رحمت پہلے گرجا تاکہ دنیا جاگ اٹھے اُس

نے اپنی چادرِ شب سے پہلے اس ہاتھ کو نکالا جس میں بجلی کا تازیانہ تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف الرحیم [illegible]

[illegible] —— [illegible]

[illegible] رحمۃ للعالمین [illegible]

لیکن خدا کی رحمت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ [illegible] تمام مشرق و مغرب [illegible] رحمۃ للعالمین [illegible] کی تفسیر [illegible]

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ۔ ہم نے آپ کو تمام دنیا کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا

[illegible]

لیلۃ القدر کو [illegible] قرآن [illegible] نہیں [illegible] عبادت کا ثواب تمام راتوں سے زیادہ [illegible]

ایک کتاب دی گئی اور ہم کو مشرق و مغرب میں اس کی منادی کرنے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہوں کی منادی طبل و علم کے ساتھ کی جاتی ہے لیکن خدا کی منادی تہلیل و تکبیر کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ رمضان کے بعد عید کا حکم اسی لئے دیا گیا تاکہ تہلیل و تکبیر کی مقدس صداؤں میں اسلام کے جاہ و جلال، فتوحات و قوت اور وسعت و اثر کا سماں دنیا کو نظر آجائے۔ ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم ولعلکم تشکرون۔

پھر آہ! تمہاری غفلت کیسی شدید اور تمہاری گمراہی کیسی ماتم انگیز ہے کہ تم لیلۃ القدر کو تو ڈھونڈھتے ہو پر اس کو نہیں ڈھونڈھتے جو لیلۃ القدر میں آیا اور جس کے ورود سے اس رات کی قدر و منزلت بڑھی۔ اگر تم اُسے پا لو تو تمہارے لئے ہر رات لیلۃ القدر ہے۔ ع

ہر شب شبِ قدر است اگر قدر بدانی

سُورۃُ العصر

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

قسم ہے اُس عصرِ انقلاب اور دورِ تغیرات کی جو پچھلے
دور کو ختم کرتا اور نئے دور کی بنیاد رکھتا ہے کہ نوعِ
انسانی کے لئے دنیا میں نقصان و ہلاکت کے سوا کچھ
نہیں مگر ہاں وہ نفوسِ قدسیہ جو قوانینِ الٰہیہ پر ایمان لائے
اور اعمالِ صالحہ اختیار کیے، ایک دوسرے کو امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کے ذریعے سے دینِ حق کی وصیت کرتے
رہے نیز صبر و استقامت کی اُنہوں نے تعلیم دی۔

Marfat.com

قرآن کا ہر اچھے معتقد کے لئے یہ اعلان ہے کہ آسمان کے نیچے نوع انسان کے لئے، انسانوں کی آسائش کے لئے، خوشیوں کے لئے اور امیدوں کے لئے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں، بڑے بڑے غم کے ٹوٹتے ہیں۔ لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے کہ بچ سکتی ہے اور ناکامیابی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے۔ نا امیدی کی جگہ امیدوں کے دل میں آشیانہ بنا سکتی ہے۔ وہ کون انسان ہیں؟ وہ انسان کہ جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً و عملاً اپنے اندر پیدا کریں۔ جب تک یہ پیدا نہ ہوں گی اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ ملک۔ حتیٰ کہ خدا کے برگزیدہ بندے بھی دنیا میں کامیابی نہیں پا سکتے۔

ان چار شرطوں سے گھبرا نہ جانا اور اگر ایک چیز کی تعبیر میں آ جائے تو کیا تم انکار کر دو گے۔ دنیا سے وہ چیز کی چاہو گے تو پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں ایمان ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ تم بھی کامیابی چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہارے دلوں

اندر، رُوح کے اندر وہ چیز پیدا ہو جائے کہ جس کا نام قرآن مجید کی زبان میں ایمان ہے۔

"ایمان" کے معنی ہیں عربی میں زوال شک کے یعنی کامل درجہ کا بھروسہ اور کامل درجہ کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے جب تک کامل درجہ کا یقین تمہارے دلوں کے اندر نہ پیدا ہو، اللہ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی پر اللہ کے اصولوں پر جس وقت تک کامل درجہ کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لئے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے تو تم کو اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہئے۔ تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر ایمان، اطمینان، یقین، تمکن اور اقرار پیدا ہو، لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل، تصوّر کا یہ نقشہ کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں!

فرمایا، ایک دوسری منزل اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک تم دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کر لو گے، اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے۔ اس کا نام قرآن کی بولی میں "عمل صالح" ہے (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یعنی وہ کام جو اچھائی کے ساتھ کیا جائے جس کام کو جس صحت اور جس طریقہ کے ساتھ کرنا چاہئے، جو طریقہ اس کے لئے سچا طریقہ ہو سکتا ہے اس کام کو اُس کے ساتھ انجام دینا۔

قرآن کا یہ اصول تو عام ہے۔ ایمان کے معنی ہیں وہ یقین، وہ کامل

اطمینان، وہ کامل اقرار کہ جو عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ چیز جو دماغ میں موجود تھی۔ وہ ارادہ جو دماغ میں پیدا ہوا تھا، وہ پہلی منزل ہوئی جو مذہب میں آکر "ایمان" کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ بالکل جیسے وہ عمل دماغ ہے، وہ عمل بطور یقین ہے۔ اس بنا پر پہلی منزل ایمان کی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو۔ دوسری منزل یہ ہے (عملوا الصالحات) کہ صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ ٹھہر جائیں بلکہ عمل بھی کرو اور وہ جو صالح ہو یعنی جو صحیح طریقہ ہے اس کام کے انجام دینے کا۔ جب اس کو پورا کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے کامیابی کے ساتھ طے کر لیں۔ مگر پھر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن کی عالمگیر صداقت کہتی ہے کہ نہیں، بلکہ دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔ اپنی ہمت تو آزما لو کہ ان کے لئے تمہارے قوے تیار ہیں یا نہیں؟ تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو کمی ہے کہ یہ دونوں منزلیں تمہارے لئے سود مند نہ ہوں ـــ کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا ہے؟ ایک منزل کے لئے بھی نہیں تم کیا ہو؟ اس بکھری ہوئی شکل میں بے کار ہو۔ اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔ قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا۔ اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے۔ اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی، زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لئے فرمایا کامیابی کا سفر کامیاب

نہیں ہو سکتا جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔

وہ تیسری منزل ان فصیح و بلیغ معنوں میں ہے کہ وتواصوا بالحق و
تواصوا بالصبر۔ تیسری منزل وتواصوا بالحق۔ کہ تم جو ایک کڑی تھے جس کو
تم نے ایمان کی مضبوطی سے استوار کیا لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا۔ تمہارا فرض
ہے کہ دوسری کڑیوں کی طرف توجہ کرو۔ ان کڑیوں درست کر سکتے ہو کہ
دنیا میں خدا کی سچائی کا پیغام پہنچاؤ۔ جب تک تم میں یہ بات ہو گی کہ تمہارا
دل سچائی کے اعلان کے لئے تڑپنے لگے۔ جب تک تواصی حق نہ کرو گے
کامیابی تم کو نہیں مل سکتی لیکن اگر اس تیسری منزل کے لئے تم تیار ہو گئے
اگر توفیق الہٰی نے تمہاری دستگیری کی تو پھر آخری منزل کون سی ہے؟ وہ ہے
کہ جو حق کی منزل کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن
اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا کہ حق کی وہ وصیت
کریں گے، چنانچہ وہ حق کا پیغام سنائیں گے، حق کی دعوت پہنچائیں گے۔ حق
کا یہ اعلان ہے کہ حق کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا جب تک وہ قربانیوں
کے لئے قدم نہ اٹھائیں۔ فرمایا کہ صرف حق ہی کا پیغام وہ نہ پہنچائے بلکہ صبر
کا بھی پہنچائے (وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر)

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے بلکہ
اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کی بولیوں کو بھی بدل ڈالا۔ صبر کے
معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے عزتی اور باطل کی پرستش۔ دیکھو
جو شخص صبر کے معنی یہ سمجھتا ہے اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف لفظی

کرنے والا کوئی نہیں۔ تحریف معنوی تو بہت سے علما کر رہے ہیں لیکن تحریف لفظی یہ ہے کہ صبر کے معنی یہ ہیں کہ اگر تمہارے اوپر حق کے مقابلہ میں مصیبت آ جائے تو تم کو چاہئے کہ صبر کے گوشے میں پناہ لو یعنی ہر طرح کی بے عزتی کو، بے چارگی کو، باطل پرستی کو قبول کر لو۔ صبر کے معنی بالکل اس سے مختلف ہیں۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کے۔ صبر کے معنی ہیں جھیلنے کے۔ صبر کے معنی ہیں تحمل کے۔ جو قدم تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب کی راہ میں [illegible] ہو اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی دشواریاں [illegible] آئیں، خطرے اور مشکلات یہاں تک آئیں کہ ممکن ہے کہ تمہارے سامنے [illegible] اس پر ایک [illegible] یہ سب تمہارے سامنے آئے گا لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو تو تمہارا فرض ہو جاتا ہے کہ تمہارے اندر صبر ہو، تمہارے اندر برداشت کی وہ اعلیٰ طاقت ہو، وہ پاور برداشت کا تمہارے اندر ہو جو دنیا کی کوئی مشکل، کوئی تاریکی [illegible] ان پر غالب نہ ہو سکے۔ یہ معنی [illegible] ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے مطابق [illegible] اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہی صبر کے یہی معنی ہیں

مقصد یہ کہ قرآن مجید نے جو صداقت دی انسان کے آگے کامیابی کے لئے پیش کی ہے اور اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنا دیا ہے یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی منشور ہے تو یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ ہم کو اب اس کے لئے غور کرنا چاہئے کہ کیا دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان کے ممکن ہے؟ کیا تم کسی [illegible] اپنے

Marfat.com

پہلو میں لے کر دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جو؟ اور چاول بھی پا سکتے ہو؟ جب تک تمہارے اندر حق کے لئے طلب نہ ہو۔ کیا ایک لمحہ کے لیئے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمہیں دکھا سکتی ہے جب تک تم حق کی راہ میں قربانیاں چڑھانے کے لیئے تیار نہ ہو۔ خدا کی کائنات کے ایک ایک ذرہ میں اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے اور اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزل سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرندے کے لئے ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمہارے لئے بدل دے گا؟ کیا خدا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکا میں پڑے ہو تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

مقصدِ مساجد

(سورۂ جنّ کی ایک آیت)

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا۔

مسجدیں صرف اللہ ہی کے لئے ہیں۔ پس مسجدوں میں اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو اور جب خدا کا مخلص (یعنی حضرت داعی الاسلام) اللہ کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو لوگ اس کے گرد اگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح نزدیک آ آ کر دیکھتے ہیں گویا قریب ہے کہ لپٹ پڑیں گے۔

(الہلال ۸۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

Marfat.com

القرآن الحکیم

مفردات میں ہے :

"المسجد بکسر الجیم موضع السجود"

اگرچہ "مسجد" کے مفہوم کے متعلق مفسرین نے طرح طرح کے اقوال نقل کئے ہیں مگر صاف بات یہی ہے جو امام راغب نے لکھی ہے یعنی مسجد بکسر جیم ہے اور اس سے وہ مقام مراد ہے جہاں فاطر السموات والارض کے آگے جبین نیاز زمین پر رکھی جائے۔ اسی کی جمع ہے "مساجد"

پس "مسجد" کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ سورۂ جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کے مقصد کی تحدید کی :

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ — مسجدیں صرف اللہ ہی کے لئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مساجد کے متعلق پہلا حکم الٰہی یہ ہے کہ وہ صرف اللہ ہی کے لئے ہیں۔ یعنی ان کے اندر صرف وہی اعمال انجام دیئے جا سکتے ہیں جو مخصوص اللہ کے لئے ہوں۔

اس کے بعد فرمایا:

فلا تدعوا مع اللہ احدًا پس مسجدوں میں اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو۔

اس جملے نے ان تمام اعمال کی نہی عام کردی جو خدا کے سوا کسی اور کے لئے انجام دیئے جائیں، خواہ وہ نسانی ہوں یا بدنی۔

امام طبریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ

افردوا المساجد بذکر اللہ تعالیٰ ولا تجعلوا لغیر اللہ فیھا نصیبًا۔

مسجدوں کو صرف اللہ کے ذکر کے لئے مخصوص کردو۔ اللہ کے سوا غیروں کے لئے وہاں کے ذکر و عبادت میں کوئی حصہ نہ ہو۔

امام طبریؒ، امام رازیؒ، حافظ ابن کثیر وغیرہم اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

قال قتادۃ، کانت الیھود والنصاریٰ، اذا دخلوا کنائسھم اشرکوا باللہ فامر اللہ نبیہ ان یوحدہ وحدہٗ۔

قتادہ نے اس آیت کے شان نزول میں کہا: یہودیوں اور عیسائیوں کا قاعدہ تھا کہ جب اپنے گرجوں میں جاتے تھے تو اللہ کے ساتھ اس کے ذکر میں بندوں کو بھی شریک کرتے تھے۔ پس اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ مسجد کو

صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص اور صرف اسی کے ذکر
کے لئے محدود کر دیں۔

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل نتائج مقصد مساجد کے متعلق حاصل ہوتے ہیں :-

۱۔ مساجد کی تعمیر اور ان کا قیام صرف اس لئے ہے کہ وہ عمارتیں اللہ کے نام سے مخصوص کر دی جائیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ اللہ کے لئے ہوں اور اسی کے ذکر و عبادت کے لئے وہاں لوگ جمع ہوں۔

۲۔ یہود و نصاریٰ کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے گرجوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس عقیدت و اطاعت اور ذوق عبادت کے ساتھ جو صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ اس آیت میں اس سے روکا گیا اور فرمایا کہ مسجدیں اللہ کے لئے ہیں نہ کہ انسانوں کے ذکر کے لئے۔

سورۂ جن کی اسی آیت کے ساتھ کا ٹکڑا ہے :

وانه لما قام عبد الله يدعوه كادوا يكونون عليه لبدا۔

اور جب خدا کا بندۂ مخلص (یعنی حضرت داعی اسلام) اللہ کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو لوگ اس کے گردا گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح نزدیک آ آ کر دیکھتے ہیں

گویا قریب ہے کہ لپٹ پڑیں گے۔

اس آیت کے شانِ نزول میں متعدد اقوال ہیں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب آنحضرتؐ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے یا قرآن پڑھتے تو حرص استماع میں لوگ ہجوم کر کے ایک دوسرے پر گرنے لگتے۔ اور نہایت قریب آ جاتے۔ اللہ نے اس کی ممانعت کی۔ امام ابن جریر نے تفسیر میں بروایت سعید بن جبیر دوسرا قول نقل کیا ہے:

لما راوہ یصلی و اصحابہ یرکعون برکوعہ ویسجدون بسجودہ — قال عجبوا من اطاعۃ اصحابہ لہ۔

جب آنحضرتؐ اور ان کے اصحابؓ کو نماز میں اس طرح دیکھتے کہ سب کے سب اُن کے جھک جانے کے ساتھ ہی جھک جاتے ہیں اور اُن کے سجدہ کرنے کے ساتھ ہی سجدہ میں گر جاتے ہیں تو اُن کی اس عجیب اطاعت و فرمانبرداری پر اُن کو نہایت تعجب ہوتا اور متحیر ہو ہو کر دیکھنے لگتے۔

حافظ عماد الدین (ابن کثیر) نے اپنی تفسیر میں بروایت حسن نقل کیا ہے:

قال الحسن۔ لما قام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول لا الٰہ الا اللہ ویدعو الناس الی ربہم کادت العرب تلبد علیہ جمیعا۔ (حاشیہ فتح البیان جلد ۱ ص ۹۵)

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے۔ لا الٰہ الا اللہ کہتے اور لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے تو اہل

عرب ہجوم کر کے پہنچتے اور ایک دوسرے پر چڑھ آتے۔

اصل یہ ہے کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جو آغاز اسلام میں آنحضرتؐ اور آپ کے ساتھیوں کی تھی۔ جب آپ نماز پڑھنے کے لئے قیام فرما ہوتے ایک جماعت آپ کے جاں نثاروں کی آگے پیچھے صف بستہ کھڑی ہو جاتی اور خشوع و خضوع اور انقطاع و قنوت کے ساتھ یہ مقدس گروہ ایک ان دیکھی ہستی کے تصور میں بے خودانہ مصروف رکوع و سجود و مشغول تسبیح و تکبیر ہوتا تو یہ منظر کفار عرب کے لئے نہایت تعجب انگیز ہوتا اور وہ اس عجیب طریق قیام و رکوع اور صفوف و متابعت امام کی عظمت و رعب سے مبہوت ہو جاتے ـــــ پھر انہوں نے اپنی شوخی و سرکشی سے اس منظر عبادت کو ایک تماشا سا بنا لیا اور نماز کے وقت جمع ہو ہو کر ہجوم کرنے لگے اور دیکھنے کے شوق میں ایک دوسرے پر ٹوٹنے لگے۔ وہ اکثر تماشہ دیکھنے والوں کی طرح بڑھتے بڑھتے اس قدر قریب آ جاتے گویا لپٹ پڑنے کے ارادے سے بڑھ رہے ہیں۔ یہی اصل حقیقت ہے جس کی طرف امام ابن جریر نے ایک روایت نقل کر کے اشارہ کیا ہے۔

Marfat.com

زیر طبع کتب

۱۔ قصص القرآن

از مولانا ابوالکلام آزاد

۲۔ باب التفسیر

از مولانا ابوالکلام آزاد

(ماخوذ از الہلال والبلاغ)

361

ابوالکلام آزاد

قرآن حکیم کی تین سورتیں

ترجمہ و تفسیر